پہلا پیج

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام			
۲۔	اداریہ	فکری زاویے ۱۔اظہار تشکر ۲۔مرد دانا کا ایک اور پیغام ۳۔نیکیوں سے اپنی جھولی بھر لینے کا موسم	مدیر	۳
۳۔	گوشۂ رمضان	روزہ رمضان-احکام ومسائل	محمد قمر الزماں ندوی	۱۱
۴۔	خاص تحریر	عہد نبوی کے نظام تعلیم وتربیت	مجیب الرحمٰن عتیق	۱۹
۵۔	تحلیل و تجزیہ	مدارس کا نصاب تعلیم	ابوفہد رامپوری	۳۳
۶۔	حالت حاضرہ	رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ	پروفیسر محسن عثمانی	۴۰
۷۔	خصائص امتیازات	امت محمدیہ خصوصیات وامتیازات	محمد قمر الزماں ندوی	۴۴
۸۔	نقد ونظر	حدیث اور محدثین کی بابت راشد شاز کا نظریہ	الیاس نعمانی	۴۶
۹۔	// //	راشد شاز اور مسجد اقصیٰ	محمد غزالی ندوی	۵۱
۱۰۔		چند فارغین برج کورس کے تاثرات	ادارہ	۶۰
۱۱۔	شعر وادب			

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

فکری زاویے

اظہار تشکر:

قارئین کے ہاتھ میں جب یہ شمارہ پہنچے گا تو ''ندائے اعتدال'' کی اشاعت کے آٹھ سال پورے ہو چکے ہوں گے، یوں تو یہ ساتویں جلد مکمل ہوگی لیکن اس سے قبل نومبر ۸ء تا جون ۹ء کی ایک جلد ہے جو صرف ''ماہنامہ اعتدال'' کے نام سے نکلی لیکن سرکاری منظوری کے سبب نام تبدیل کرنا پڑا۔

''ندائے اعتدال'' کی اشاعت کے تسلسل اور مقبولیت میں اضافہ پر ہمارا رواں رواں رب کریم کے حضور نذرانہ تشکر پیش کرتا ہے، جن حالات میں یہ شروع ہوا تھا اور جن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچا یہ از خود کسی عجوبہ سے کم نہیں، بے سروسامانی، وسائل کی تنگ دامانی، انتظام سنبھالنے والی کی نا تجربہ کاری و ناپختہ کاری، ادارہ اشاعت کی گمنامی، کے باوجود ایک ایسے دور میں اس کے پابندی کے ساتھ جاری رہنے پر ہم اگر صد ہزار بار رب کریم کا شکر ادا کریں تو کم ہے جس دور میں مادیت پسندی کے سبب مذہب بیزاری عام ہو، اردو اور بالخصوص مذہبی رسائل سے بعد ہو، غیر معروف شخصیات کی نگارشات ردی خانہ کی نذر کر جاتی ہوں، معروف شخصیات کی فعال شمولیت لازمی سمجھی جاتی ہو، اس صورت میں ''ندائے اعتدال'' کا باقی و جاری رہنا ہی نہیں بلکہ اپنی جگہ دلوں میں بنا لینا محض فضل خداوندی اور خلوص و لگن کے ساتھ صحیح فکر و احساسات کی ترجمانی اور دعوت دین، تعلیم و ادبی تحریک کی آبیاری کا ہی نتیجہ ہے ؂

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

''ندائے اعتدال'' کے اجراء کا خیال راقم سطور کے ذہن میں وارد ہوا، راقم الحروف نے اس کا خاکہ، وجوہ و اسباب اور فوائد و امکانات ایک مجاہد صفت انسان، پیکر اخلاص و مجسمۂ اخلاق بانی ادارہ ڈاکٹر محمد غیاث صدیقیؒ کے سامنے پیش کیا، ڈاکٹر صاحب قبلہ نے بھرپور تائید کی اور فرمایا کہ خیال اچھا ہے، مشکلات آئیں گی مگر بزبان حال وہ یہ کہہ گئے کہ ''موج حوادث سے ہنستے کھیلتے اور مسکراتے ہوئے گزر جانا ہماری فطرت ہے''، فرمایا نام بھی آپ ہی سوچیے اور کام شروع کر دیجیے، راقم الحروف اس عزم مصمم اور حوصلہ افزائی اور فوری مثبت ردعمل پر ساکت و مبہوت رہ گیا، بہر حال رب کریم نے جو مقدر کیا تھا وہ خدمت شروع کر دی گئی، تقریب رسم اجراء بھی بڑی آن بان سے منعقد ہوئی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی صاحب دامت برکاتہم کی صدارت میں یہ محفل منعقد ہوئی، فاضل گرامی ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے اپنا معنی خیز و تجزیاتی تبصرہ پیش کیا، محب گرامی ڈاکٹر اشہد رفیق صاحب نے اپنے حقیقت پسندانہ تاثرات کا اظہار کیا، بخدا ہمیں ان تاثرات پر آج ایک نظر ڈالنے کے بعد بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ رسالہ تبصرہ نگاروں کے مشوروں اور امیدوں کو رفتہ رفتہ بر لانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے، اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ اسے اہل صدق و صفا کی سرپرستی حاصل رہی، بزرگوں کی دعائیں ملتی رہیں، اہل فکر و نظر کے مشورے جلا بخشتے رہے، فکر اسلامی کے حاملین فکری غذا فراہم کرتے رہے، عزم و اخلاص کے پیکر بانی اور تعمیر و ترقی کے جذبات سے معمور نگراں ڈاکٹر غیاث صدیقی مرحوم کی تگ و دو مہمیز کرتی رہی، اس طرح یہ رسالہ اہل قلم کی توجہات، رفقاء و معاونین کی جانفشانیوں اور کارکنان کی کوششوں کے نتیجہ میں نہ صرف زندہ رہا بلکہ

زندگی کی نوید سناتا رہا، اس اثناء میں اس نے نشیب وفراز کے کئی دور دیکھے، مالی بحران تو گویا اس کا مقدر ہے، لیکن سب سے خوفناک وہ ساعتیں تھیں جب مختلف اسباب اور بالخصوص تنگ دستی کے سبب متعدد مرتبہ اس کے بند کردیے جانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا، مگر کسی کے خلوص، کسی کی دعا اور کسی کی تڑپ ہر بار رنگ لائی اور یہ ترسیل فکر وتبلیغ دین کے اپنے انقلابی واحیائی مشن میں رواں دواں رہا، بالاخر اکتوبر ۲۰۱۵ء میں اس نے ڈوبتی نبض، نمناک آنکھوں اور لرزتے ہوئے قلم سے جاری آنسوؤں سے اپنے بانی کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا۔

سب کھو کے تیری راہ میں دولت دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

ہماری قوم کا المیہ ہے کہ ڈھارس کم بندھائی جاتی ہے، ٹانگیں زیادہ کھینچی جاتی ہیں، منفی اثرات اندیشہائے دور دراز اور بے جا خدشات کا ذکر پہلے ہوتا ہے اور مثبت نتائج سے آنکھیں پھیر لی جاتی ہیں، یہی کچھ اس رسالے کے اجراء کے موقع پر تھا، راقم الحروف سے متعدد چبھتے ہوئے سوالات کیے گئے تھے سب سے بڑا اور مشترک سوال یہی تھا کہ رسائل کی بھیڑ میں ایک اور رسالہ کی کیا ضرورت؟ مختلف حضرات نے دلجوئی کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے تبصرے کیے تھے کہ ارادہ پاش پاش ہوتے ہوتے رہ گیا، اس وقت پہلے شمارے کے سرورق پر راقم نے مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک شاہکار اقتباس بطور جواب واظہار عزم شائع کیا تھا، جس کی معنویت آج بھی تر وتازہ ہے، جس سے آج بھی زندگی کی تحریک ملتی ہے اور جس کے پیغام کا یہ رسالہ بحمد للہ حامل ہے، ملاحظہ کیجئے یہ معنی خیز اقتباس:۔

’’انسان کا فرض سعی وتدبیر ہے، اور وہ جب تک اس دنیا کی سطح پر باقی ہے اس کو سعی کوشش سے باز نہیں آنا چاہیے، ہمارا کوئی عزیز بیمار ہوتا ہے اور اس کی حالت صحت کی طرف سے مایوس کردیتی ہے، ڈاکٹر بھی جواب دے دیتے ہیں، تاہم سعی وعلاج سے آخری ساعات نزع تک باز نہیں آتے، جب افراد کے ساتھ ہمارا حال یہ ہے، تو تعجب ہے کہ قوم وملت کے ساتھ نہ ہو، کس کو معلوم ہے کہ کب دروازہ رحمت کھلنے والا ہے؟ اور کب بارش ہونے والی ہے؟ انسان کا کام یہ ہے کہ صرف تخم پاشی کرتا رہے‘‘

الحمد للہ اور صد ہزار بار الحمد للہ ’’ندائے اعتدال‘‘ تخم پاشی کی مہم میں رواں دواں ہے، یہ الگ بات کہ اس عرصہ میں اس نے ’’اپنوں کی سادگی‘‘ اور ’’غیروں کی عیاری‘‘ پر بھی لب کشائی کرنی پڑی، عالم اسلام کی خوں آشام داستانیں بھی ثبت کرنی پڑیں، عالم عربی کی مردہ ضمیری پر بھی ماتم کرنا پڑا، اہل اسلام کی قربانیوں کو خراج عقیدت بھی پیش کی، ملکی حالات پر ہمیشہ ٹھوس اور مثبت رویہ اختیار کیا، تعلیم و تربیت اور درس وعبرت ہمیشہ اس کا مطمح نظر رہا، علم وتحقیق اور ادبی رویوں کو اس نے ہمیشہ اپنے دامن میں جگہ دی، بخدا یہ سوچ کر رواں رواں جذبہ شکر سے معمور ہوجاتا ہے کہ اس پورے عرصہ میں ’’ندائے اعتدال‘‘ نے مفاد وموقع پرستی، شخص وشخصیت پرستی، ابن الوقت سے مرعوبیت، مداہنت ومجاملت اور مادیت پسندی سے دور رہ کر ’’اسلام پرستی‘‘ صحیح افکار کی ترویج، فتنہ اغیار کی تردید، لچر اور غیر اسلامی مواقف کی بے لاگ تنقید اور قرآن وسنت سے مستفاد اعتدال وحکمت کو اپنا شعار بنایا ہے، نو زائیدہ افکار کے ہجوم، ملی انتشار، قومی زوال اور مادیت کے جال سے بچ کر صحیح اور بے لاگ فکر وموقف کی ترجمانی اس دور میں انعام خداوندی کے سوا کچھ نہیں، اس فضلِ خداوندی کے سبب برملا حق گوئی اس رسالہ کی پہچان بنی، اس دور کی خطرناک، غیروں کی سازشیں اور اپنوں کے کردار سے مرکب زمانہ کے خوفناک تیور کا اندازہ مصر میں اخوان حکومت پر غاصبانہ قبضہ، محمد المرسی کی قید اور بنگلہ دیش میں ارکان جماعت اسلامی کو تختۂ دار پر چڑھائے جانے سے کیا جاسکتا ہے، اخوان وجماعت کے بعض افکار سے اختلاف ہو تو ٹھیک لیکن یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ محض حصول دنیا اگر مقصد ہو تو جانوں کا نذرانہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، حسن

البنا شہید اور سید قطب سے لے کر مطیع الرحمٰن نظامی تک جبر واستبداد کی داستان یہی بتاتی ہے کہ دنیا کو اسلام سے بیر نہیں لیکن اسلامی نظام کی بابت سننا بھی پسند نہیں۔ ظاہر ہے کہ افراد کو تو موت کی نیند سلایا جاسکتا ہے لیکن افکار ونظریات میں اگر صداقت ہے تو انہیں موت نہیں آتی، حسن البناء کو سرراہ گولی ماردی گئی، مردوں پر پابندی عائد کرکے خواتین کو جنازہ اٹھانے پر مجبور کیا گیا لیکن کیا وہ فکر ونظریہ بھی حسن البنا کے ساتھ دفن کیا جاسکا جس کے وہ علمبردار تھے، وہ اسلام کی زندگی اور اس کے غلبہ کے قائل تھے، ایک زمانہ اسی کا قائل ہوا اور ہوتا رہے گا، تحریکات اسلامی کی ہوائیں چلتی رہیں گی، اہل اسلام کی شہادتیں ہوتی رہیں گی، اغیار اپنا کام جاری رکھیں گے مگر جس دن ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ ہمارا ایمان مکمل ہے اور ہم مومن کامل ہیں اسی دن اسلام کو غلبہ بھی حاصل ہوجائے گا و أنتم الأعلون ان كنتم مومنين۔

''ندائے اعتدال'' زندگی کی نوید سناتا رہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ بھی زندہ رہے، کیا ہی خوب ہو کہ قارئین اس حوالہ سے تھوڑی سی سنجیدہ کوششیں کرلیں۔ کچھ اس کا تعاون کردیں، کچھ اس کے ممبر بناڈالیں۔ کچھ لوگوں سے اعزازی رکنیت کی درخواست کرلیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی زندگی اور اس کے ذمہ دار و متعلقین کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ آپ کی کوششیں اور دعائیں ہی اس کی توسیع اشاعت کی فوری ضرورت کو پوری کرسکیں گی، خدا کا شکر ہے کہ جتنی کاپیاں چھپتی ہیں سب نکل جاتی ہیں، ادھر کئی سالوں سے ایک بڑی تعداد PDF کی شکل میں انٹرنیٹ پر پڑھتی ہے، مگر پھر بھی ادھر کئی مہینوں سے شدید تقاضہ ہے کہ اس کی اشاعت میں اضافہ کیا جائے لیکن قلت وسائل نے بیڑیاں ڈال رکھی ہیں۔ دعا کیجئے کہ یہ مسائل بھی حل ہوں نیز ''ندائے اعتدال'' مزید افادیت ومعنویت کے ساتھ خدمت دین و دعوت اور علم وادب کی ترویج واشاعت میں جاری وساری رہے۔

مرد دانا کا ایک اور پیغام:

ان دنوں ترکی کے متعلق تین اہم خبریں نظر سے گزریں، کچھ تشویش میں اضافہ ہوا، کچھ دھڑکنیں تیز ہوئیں مگر جذبۂ ایمانی نے ضرور راحت کی سانس لی، ٹوٹے دلوں کو سہارا ملا، مظلوموں کی ڈھارس بندھی، ترکی کے بطل جلیل، مرد دانا اور غیور حکمراں رجب طیب اردو غان کا وجود ہی شاید ملت کے آنسو پونچھنے، بیواؤں کو سہارا دینے، یتیموں کی کفالت کرنے اور مظلوموں کی آہ وفغاں سننے کے لئے ہے۔

اردوغان صاحب آپ سلامت رہیں ہزار برس اور ہر برس کے دن ہوں ہزار، اس دور زوال میں آپ ہی سے امیدوں کا چمن شاداب ہے، آپ کے جرأت مندانہ اقدامات آپ کے اس فکر کا پتہ دیتے ہیں کہ ''فرد ملت سے ہے ملت جو نہیں کچھ بھی نہیں'' آپ کو واقعی اس پر یقین ہے کہ مومن جہاں بھی ہو وہ ایک جسم ہزار جان کے مانند ہے، مصر میں اخوانی حکومت کے غاصبانہ خاتمہ پر آپ تڑپ گئے اور اقوام متحدہ میں عشائیہ کے دوران آپ نے دسترخوان پر ظالم کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کیا، لاکھوں شامیوں کی آپ نے نہ صرف کفالت کی بلکہ ان کو عام زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کیے، شامی نونہالوں کے لیے علحدہ اسکول کا قیام عمل میں لائے بلکہ متعدد مرتبہ آپ نے لٹے پٹے شامی یتیم بچوں کو اپنی آغوش میں لے کر باپ کے لاڈ پیار کا احساس دلایا، غزہ کی مدد میں آپ پیچھے نہ رہے، برما بھی آنسو پونچھنے آپ پہنچ گئے، اب بنگلہ دیش کے جرم وظلم پر آپ کے موقف پر آپ کو صد ہزار مبارکباد ــــ آپ نے وہاں سے اپنے سفیر کو بلایا اور ترکی میں موجود بنگالی ایمبیسی کو سیل کیا اور ''بنگالی حسینہ'' کی فضیحت کرکے جس دینی غیرت اور ملی حمیت کا مثبت پیغام دیا ہے اس سے یقیناً امیدوں کی کرن روشن ہوئی ہے مگر خدشات بھی بڑھ گئے ہیں، اللہ حاسدوں کے حسد اور فریبیوں کے فریب سے آپ کی حفاظت فرمائے۔

آج پوری ملت ظلم کے لئے تختۂ مشق بنی ہوئی ہے، ان حالات میں ایک نام نہاد مسلم ملک کی ظالم وعیش پرست اور ذہنی غلام

حکمراں نے سیاسی انتقام میں پاگل ہوکر بوڑھے افراد کو بھی تختۂ دار پر لٹکانا شروع کر دیا ہے، مولانا مطیع الرحمٰن نظامی شہید ۷۳ سال کے تھے، وہ دوبار وزیر بھی رہ چکے تھے، خود حسینہ واجد سے بھی ان کا سیاسی اتحاد رہ چکا تھا، لیکن خالدہ ضیاء کی پارٹی سے جماعت اسلامی کے اتحاد نے حسینہ کو زبردست شکست دی تھی، جس کے بعد اس نے پاگل ہوکر جماعت اسلامی کی قیادت کو ہی ختم کر ڈالنے کا عزم کر لیا، گزشتہ دنوں جن افراد جماعت کو پھانسی دی گئی ان کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے ۱۹۷۱ میں متحدہ پاکستان سے علحدگی پسند بنگالی تنظیم کے مقابلہ مسلح پاکستانی افواج کا تعاون کیا تھا، وہ اپنے وطن کے ٹکڑے نہیں گوارہ کر سکتے تھے، اسباب وجوہات سے قطع نظر یہ موقف کسی طرح بھی غلط نہیں قرار دیا تھا، قیام بنگلہ دیش کے بعد یہ سہ فریقی معاہدہ ہوا کہ ماضی کے تمام اقدامات کو بھلا کر ایک نئی زندگی شروع کی جائے گی اور تینوں ملکوں کے افراد کا تبادلہ ہوگا، ماضی کے کسی واقعہ کی بنا پر کسی بھی شخص سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ جنگ کے دوران جو حالات ہوتے ہیں وہ ہوئے، مگر معاہدہ کی رو سے اس کے بعد اب کسی کو مجرم نہیں شمار کیا جائے گا، جماعت بھی اب نظریاتی طور پر نئے وطن کو تسلیم کر کے قومی دھارے بلکہ سیاسی دھارے میں شریک ہوگئی، لیکن انتقام کی آگ میں جل کر حسینہ واجد نے ۲۰۱۰ء میں جنگی جرائم ٹریبونل قائم کیا، ان شہیدوں پر چوری، لوٹ مار، اغوا، قتل اور زنا جیسے گھناؤنے الزامات عائد کیے گئے حالانکہ جرم صرف یہ تھا کہ انہوں نے تقسیم کی مخالفت میں مسلح افواج کا ساتھ دیا تھا، ایسے جرائم کے الزام سے بھی گھن آتی ہے، وہ بھی ایسے لوگوں پر جنہوں نے محض جذبۂ صادق اور صحیح موقف کی خاطر جان کی بازی لگائی، اگر کوئی جماعت کے بیشتر مواقف اور اقدامات ونظریات سے اختلاف کرے تو یہ ممکن ہے مگر بغیر جذبۂ صادق ومخلص کے جانوں کی بازی لگانا ممکن نہیں، عالمی انسانی حقوق کمیشن اور ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بھی اپنی رپورٹ میں واضح کر دیا ہے کہ اس ٹریبونل کے ذریعہ انصاف کے تقاضے نہیں پورے ہو رہے ہیں، مگر پھر بھی حیرت ہے مذہبی قیادتوں اور بے غیرت حکمرانوں پر کہ کسی نے احتجاج تک نہیں کیا، محمد المرسی کی قید اور نظامی کی موت سے اندازہ کر لینا چاہیے کہ دنیا کا رخ کیا ہے اور وہ مسلمانوں کو کس حالت میں رکھنا چاہتی ہے۔

رجب طیب اردغان نے پیغام دیا ہے کہ دینی غیرت وحمیت کے ساتھ جب حکمراں آزاد ہو اور اس کی معاشی بنیادیں مضبوط ہوں تو اس کے لیے جرأت مندانہ اقدام بہت آسان ہوتے ہیں، اردوغان کی مومنانہ بصیرت وفراست کا نتیجہ ہے کہ ترکی نہ صرف آئی ایم ایف کے قرض سے آزاد ہوا بلکہ اب وہ آئی ایم ایف کو قرضے دے رہا ہے، خلیج سے ترک اپنے وطن واپس ہوگئے، دولت کی ذخیرہ اندوزی کے بجائے ترکی میں دولت کی گردش Rotation شروع ہوئی، سیکولر ترکی رفتہ رفتہ اسلامی ترکی کی طرف بڑھنے لگا، مگر وہ عناصر ابھی زندہ ہیں جو ترکی کی پیشانی پر اسلام کے جھومر کو دیکھنا گوارہ نہیں کر سکتے، جیسے ہی پارلیمنٹ میں اسپیکر نے یہ بیان دیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ جو ترکی ایک مسلم ریاست کے طور پر جانا جاتا ہے اس کے آئین کے ساتھ اب ''سیکولر'' کی جگہ ''اسلامی'' کا الحاق کیا جائے، ساری بلیاں تھیلے سے باہر آگئیں، سڑک پر ''اسلامی آئین'' کی مخالفت میں مظاہرے ہوئے، مگر مرد دانا حکمت وفراست کی مدد سے رفتہ رفتہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے، وزیر اعظم احمد داؤد اوغلو کا استعفی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو پارٹی کی پالیسی کے حق میں ہے، اردوغان اپنی منزل کو پانے کے لیے مختلف انداز سے تگ ودو کرتے آئے ہیں، صدارتی نظام کا نفاذ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، موقع بموقع اردوغان نے یہ احساس پختہ تر کر دیا ہے کہ ترکی میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور اسلام پسندوں کی قوت سے ملت اسلامیہ کو تقویت ملے گی، انہوں نے اس موقع پر بھی مسلم ممالک کے حکمرانوں کو للکارا ہے، ان کی غیرت کو جھنجوڑا ہے، اور انہیں ان کی منافقت کا احساس دلایا ہے، بے حس حکمرانوں اور احساس ذمہ داری اور ملی شعور سے دستبردار ہو چکی مذہبی قیادتوں کو اردوغان سے نصیحت حاصل کرنا چاہیے، اللہ اس ''ترکمان سخت کوش'' کا حامی وناصر ہو، مصلحت کوشوں کو اس سے سبق لینے کی توفیق دے اور دشمنان اسلام کو

ان کا مطیع وفرمانبردار کردے۔ان الله على كل شئى قدير____ وما ذاك على الله بعزيز.

نیکیوں سے اپنی جھولیاں بھر لینے کا موسم

رمضان نیکیوں کا موسم بہار ہے، ایک ایک نیکی کا ثواب کئی کئی گنا ملتا ہے، بعض روایتوں میں تو کہا گیا ہے کہ اس مہینہ میں ایک نیکی کا ثواب ۷۰۰ گنا اضافہ کے ساتھ ملتا ہے، گویا رب العزت اپنی رحمت کے دہانے کھول دیتے ہیں، خزانے بہا دیتے ہیں، یہ تو کمزور انسانوں کے نفع حاصل کرنے کی بات ہے کہ کون کس قدر اپنا مقدر سنوارتا اور اپنی قسمت جگاتا ہے، یہ عبادتوں کا مہینہ ہے، قرآن سے اس ماہ کو خاص نسبت ہے، اس ماہ میں تلاوت کا مزہ ہی کچھ اور ہے، روزہ کی حالت، صبر وامساک (اپنے آپ کو روکنے) کی کیفیت کے ساتھ ذہن سے رب کا کلام جاری ہو تو ذائقہ ہی کچھ اور____ مزید اگر سمجھ سمجھ کر ہدایت کی نیت سے پڑھا جائے تو لطف دوبالا۔

روزہ کا یہ مزہ یہ احترام اور یہ مرتبہ کیوں نہ ہو، یوں تو بندے کے ہر عمل کا بدلہ رب کریم ہی عطا کریں گے مگر روزہ کی نسبت بالخصوص اپنی طرف کی ہے فرمایا "كل عمل ابن آدم له الا الصوم فانه لى" رب کریم کی جلالت شان اور اس کی عظمت کی طرف جس کی نسبت ہو جائے اس کا کیا کہنا، فرمایا روزہ کا اجر میں خود دوں گا کیوں کہ یہ عمل خاص میرے لیے ہے، فرمایا ''الصوم لى وأنا أجزى به" یہ ایسے ہی ہے جیسے خانۂ کعبہ کو شرف عطا کرنے کے لئے اس کی نسبت اپنی طرف فرمائی "وطهر بيتى" (الحج ۲۶) اور نبی کریم ﷺ کی عظمت کو دوبالا کرنے کے لئے فرمایا سبحن الذى اسرى بعبده، روزہ واقعی صرف خدا کے لئے ہی ہے، کیوں کہ اس کی خصوصیت بھی ہے کہ یہ اللہ کے دشمن کے لیے قہر کی مانند ہے، دشمنِ خدا کا سب سے کامیاب ہتھیار خواہشات نفس ہیں اور روزہ خواہشات وشہوات کا قاتل ہے، اس کا نام ہی ''الصیام'' یعنی اپنے آپ کو کھانے پینے اور جماع سے روکنا، اس کے معنی صبر کے بھی ہیں، یہ بات سمجھنے کی ہے، کہ کھانا پینا ہی درحقیقت شہوات کے لیے راستہ کھولتا ہے اور پھر اس راستہ سے شیطان کا آنا آسان ہوتا ہے لیکن جب اکل وشرب ہی متروک ہو جائے تو پھر کوئی بد قسمت ہی شیطان کے دامِ فریب کا شکار ہوگا، اگر پھر بھی ایسا ہوتا ہے تو اس کے پیچھے ہمارے کھانے پینے کے اہتمام میں بے اعتدالی بلکہ بسا اوقات اسراف کی حد تک چلے جانے کا دخل ہوتا ہے، رات کی عبادت وریاضت شام کو حلق تک بھر لینے کی نذر ہو جاتی ہے اور دن سحر میں حلق تک ٹھونسنے کے سبب پیٹ کی تکلیفوں یا شکم سیری کے سبب روزہ کے احساس سے عاری گزر جاتا ہے، اس طرح وہ مقصد فوت ہو جاتا ہے جو روزہ کا لازمی جزء ہے۔

روزہ فرض بھی ہے، واجب بھی اور نفل بھی، رمضان کے روزے فرض ہیں، کفارہ ونذر کے روزے واجب ہیں اس کے علاوہ روزے نفل ہیں، بعض اہل علم نے روزے کی ایک اور تقسیم کی ہے اور واقعی وہ تقسیم بڑے مزے کی ہے اور ہمیں اپنے روزے کے احتساب کی دعوت دیتی ہے، ایک تو عام روزہ ہے جس میں روزہ دار اپنے پیٹ اور شرمگاہ کو اپنی خواہش پوری کرنے سے روکے رکھتا ہے، دوسرا خاص روزہ ہے جس میں روزہ دار پیٹ اور شرمگاہ کے ساتھ نظر، زبان، ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء کو گناہوں سے باز رکھتا ہے، ایک تیسرا خاص الخاص روزہ ہے، صحیح معنی میں یہی روزہ مستحسن ومطلوب ہے، کہ کھانے پینے سے باز رہنے اور تمام اعضاء بدن کو گناہوں سے باز رکھنے کے ساتھ دل کو بھی گھٹیا خیالات کی آمد وآلائش سے پاک رکھا جائے، اور ایسے افکار میں بالکل نہ الجھا جائے جو اللہ سے دور کرنے والے ہوں، بلکہ اللہ کے سوا کسی کی طرف توجہ ہی نہ کی جائے، فرض تو صحیح معنی میں دوسری قسم کے روزے سے ہی خوب خوب ادا ہو جائے گا مگر یہ تیسری قسم کے روزے کی توفیق مل جائے تو قسمت ہی بدل جائے، پھر دل ودماغ کو جو لطف ملے گا اسے وہی محسوس کر سکتا ہے جسے تقرب الٰہی کی حلاوت کا کچھ اندازہ ہو۔

روزہ کا تعلق جسم سے بھی ہے اور روح سے بھی، وہ عبادت تو ہے ہی مگر اس کا تعلق سماج سے بھی ہے، روزہ اہل تقوی کو مزید تقویت دیتا ہے، خواہشات سے لڑنے والوں کے لیے ڈھال بن جاتا ہے، مقربین کی ریاضت ہے، بندے اور خدا کے مابین ایک رازدارانہ عبادت ہے، یہ ایک ایسی عبادت ہے جو بڑی حد تک ریاکاری کے عنصر سے پاک ہے، کوئی اگر روزہ نہ رکھے تو انسانوں سے راز رکھ سکتا ہے مگر اللہ سے نہیں، کسی نے رکھا یا نہ اللہ کو ہی معلوم ہوگا، اسی لیے تو یہ بندے اور خدا کے درمیان ایک خاص روزداری والی عبادت ہے، اعضاء وجوارح پر اس کے خاص اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس سے صحت بنتی اور سنورتی ہے، جسم کے لیے نقصان دہ مادہ روزہ کی بدولت کم ہوتا ہے، روزہ بشارت ہے، حصول جنت کا ذریعہ ہے، نفس کی پاکیزگی کا وسیلہ ہے، اعضاء بدنیہ کی حفاظت کا سامان ہے، اس کی بدولت طاعت الٰہی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور رب کی محبت کا ذائقہ ملتا ہے، روزہ مزاجوں میں اعتدال کو فروغ دیتا ہے، نفس کی سرکشی کو لگام دیتا ہے، روزہ انسانی فطرت کی نیکی اور استقامت وقوت ارادی کی دلیل ہے، روزہ کی بدولت انسان کو حرام چیزوں سے دور رہنے اور گناہوں سے بچنے کی عادت پڑتی ہے اور روزہ کی حالت میں تو گویا اس کے پاس محرمات میں نہ پڑنے کی ضمانت ہوتی ہے، اس کے سبب خوف خدا سے بھی آشنائی ہوتی ہے، (لفظ آشنائی اس لیے استعمال کیا کہ خشیت الٰہی ہمارے اعمال کے سبب گویا معاشرے میں مفقود نظر آتی ہے) روزہ ہی تو ہے جس سے خلوت وجلوت میں خدا تعالی کا استحضار رکھنے کی عادت پڑتی ہے، روزہ روزہ دار کو سکھاتا ہے کہ اس کی حیثیت دیگر مخلوقوں کی طرح نہیں کہ وہ جب جہاں اور جیسے چاہے منہ مار دے، گویا روزہ روزہ دار اور دیگر مخلوقات کے درمیان ایک امتیاز پیدا کر دیتا ہے، روزہ میں مومن کی جنگ شیطان سے ہوتی ہے، اس کا جسمانی پہلو اگر دیکھنا ہے تو یوں دیکھیے کہ معدہ کا فساد اکثر امراض کی جڑ ہے اور بھوک بہت سے امراض کی دوا ہے، اگر واقعی روزہ اور ماہ رمضان کی رعایت کی جائے اور اس کے مقاصد کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ ایک مہینہ پورے سال کے نظام ہضم اور جسمانی صحت کے لیے مفید ثابت ہو، اس روزہ کے ذریعہ سماج میں پائے جانے والے کمزوروں غریبوں اور مسکینوں کے فقر وفاقہ کا احساس جاگتا ہے، اور اس احساس کو جگانا مقصود بھی ہے، مریضوں کی نعمتوں سے محرومی کا احساس پیدا ہوتا ہے، اگر یہ احساس جاگ جائے تو پھر محنت وصول، روزہ دار اپنی محنت میں کامیاب، اب جس طرح اس نے اطاعت رب کی خاطر نعمتوں سے لذت حاصل نہ کر پانے پر صبر کیا تھا اور باوجود قدرت کے محض خوف خدا کی خاطر رکا رہا تھا، اسی طرح ان کی فراوانی وحصول پر جذبہ شکر سے معمور وسرشار ہوگا، پھر وہ محتاجوں کا ملجأ وماوی ہوگا، مسکینوں کا مددگار ہوگا، مریضوں کا تیماردار ہوگا، فقر وفاقہ سے پریشان حالوں کی دستگیری کرے گا اور اسی طرح وہ روزے کے اس سماجی تعلق کو بھی حاصل کر لے گا جو از خود ایک بہت بڑی خدمت ہے، خدمت خلق سے خدا ملتا ہے، یہ رسول اللہ کی سنت ہے اور تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے، روزے کے یہی فوائد تو ہیں جس کے سبب حضرت داؤد علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن بغیر روزہ کے رہتے تھے، اسی کو صیام الدہر یا صیام داؤدی کہتے ہیں، حضورﷺ نے بھی اس کو "اعدل الصیام" یعنی روزہ رکھنے کا سب سے مناسب طریقہ قرار دیا ہے، اگر کسی میں یہ طاقت نہ رہے تو اس کو آپؐ نے ایک دن روزہ رکھنے اور دو دن افطار کرنے کی تعلیم فرمائی ہے، روزہ کے فوائد کے حصول اور بہت سے احساسات کو پیدا کرنے کے لئے جناب رسالت مآب ہر ماہ تین روزہ رکھتے تھے، آپؐ نے کبھی بھی ایک ماہ مسلسل ومکمل سوائے رمضان کے روزہ نہ رکھا، رمضان کی عظمت اور استقبال آپ یوں فرماتے تھے کہ شعبان کے اکثر ایام روزہ رکھا کرتے تھے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں وما رأيته في شهر اكثر منه صياما في شعبان.

رمضان خیرات وبرکات کی موسلادھار بارش کا موسم ہے، نیکیوں کا موسم بہار ہے، عبادتوں کے لیے سنہرا موقع ہے، ایسا موسم

تجارت ہے کہ نفع ہی نفع، نقصان کا کوئی اندیشہ ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ ہمارے صلحاء وعلماء واسلاف رمضان میں خیرات وصدقات کثرت سے کرتے تھے، زکوۃ کے سلسلہ میں جمہور علماء امت کی رائے اسی لیے یہ ہے کہ اس کی ادائیگی رمضان میں زیادہ مناسب ہے، رمضان روح وجسم کی تطہیر کا مہینہ اور زکوۃ مال کی تطہیر کا باعث، اس حیثیت سے بھی دونوں میں بڑی یکسانیت، رمضان میں اس کی ادائیگی سے خود رمضان کے سماجی تعلق وذمہ داری کی ادائیگی میں بھی بڑی معاونت حاصل ہوگی، پھر اپنے ذمہ فرض ڈھائی فیصد (۲½%) کی ادائیگی کے نتیجہ میں فرض کی ادائیگی کا اجر ستر گنا بڑھ کر ملے گا، دنیاداروں کی زبان میں یہ بونس Bonus ہی تو ہوا، انہیں تو پھر اس کی طرف اور لپکنا چاہیے، پھر یہ ستر گنا، سو گنا اور سات سو گنا تحدید کے لیے نہیں، اللہ تو اس پر قادر ہیں کہ جس قدر چاہیں عطا کردیں، یہ تو انسانی مزاج کے پیش نظر تکثیر کے اظہار کا ذریعہ ہے، ورنہ اس کی رحمت کی وسعت کا اندازہ کس کی مجال جو کر سکے!! رمضان وزکوۃ کا یوں بھی بڑا گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے کہ متعدد آیات واحادیث میں دونوں کی ادائیگی کا حکم ایک ساتھ دیا گیا ہے اور مقاصد میں بھی بڑی یکسانیت ہے، ادائیگی زکوۃ بہت مشکل کام ہے، اس مشکل کو جو ادا کرلے وہ واقعی بڑا دل والا ہے، اس سے واقعی اطاعت حق تعالیٰ اور خدمت انسانیت کا جذبہ فروغ پاتا ہے، یہ مال کی تطہیر کے ساتھ دوسروں کے حقوق ادا کرنے پر ابھارتی ہے، صدقِ ایمان کی دلیل ہے اور خواہشِ نفس کی اتباع سے بچنے کا نسخہ ہے، زکوۃ کو ٹھیک طریقہ سے ادا کرنے والا ہوس کی لعنت اور حرام مال کمانے کے عذاب سے اکثر محفوظ رہتا ہے، بہت سے مالداروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ ٹھیک سے اپنے روپیہ، سونا چاندی اور مال تجارت کا حساب نہیں کرتے، یوں ہی اندازے سے ایک مقدار نکال دیتے ہیں، زکوۃ نکلنی تو تھی لاکھ دو لاکھ مگر دس بیس ہزار نکال کر وہ سمجھتے ہیں کہ زکوۃ ادا ہوگئی، یہ بھی مشاہدے کی بات ہے کہ لوگ زکوۃ نہ دینی پڑے اس کے لیے حیلے بہانے تلاشتے، ظاہر ہے کہ یہ بڑی جرأت کا کام ہے ورنہ خدا تو دلوں کا حال جانتے ہیں ان سے کون حیلہ کر سکتا ہے، سچی بات یہ ہے کہ اس طرح کی حرکتوں سے زکوۃ کیا ادا ہوگی گناہ مزید کھاتے میں جڑ جائے گا اور پھر زکوۃ کے مقاصد وفوائد کا حصول تو یکسر ناممکن ہے، زکوۃ کی صحیح طور پر ادائیگی سے نہ صرف مال میں برکت ہوتی ہے اور وہ بڑھتا ہے بلکہ یہ استحضار بھی پیدا ہوتا ہے کہ مال اللہ کا ہے، اس نے بندے کو صرف اس میں تصرف کا اختیار دیا ہے، چنانچہ اللہ کی مرضی کے مطابق زکوۃ کی ادائیگی، مالک حقیقی کا شکر ادا کرنے کی علامت ہے، ظاہر ہے کہ فرد ملت سے ہے، ملت نہیں تو کچھ نہیں، ملت کی تعمیر وترقی افراد کی خوشحالی سے عبارت ہے اور زکوۃ اس کا ایک بہترین ذریعہ ہے، اس کی صحیح ادائیگی سے معاشرے میں پائی جانے والی بہت سی برائیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

اسی سے متصل ومتقارب ایک حکم صدقہ فطر کا ہے، جس کی تعداد بہت تھوڑی اور معمولی ہے، یہ خاص رمضان کی زکوۃ بلکہ روزوں میں رہ جانے والے نقائص کے بدل کے طور پر واجب ہے، یا یوں کہیے کہ رمضان کی عظیم نعمت کے حصول پر ادائے شکر کا اظہار ہے، اسی لیے اس کی ادائیگی میں زکوۃ جیسی شرطیں نہیں رکھی گئیں، بلکہ یوں حکم دیا گیا کہ جس کے پاس ضرورت اصلیہ سے زائد اس قدر مال ہو کہ وہ نصاب تک پہنچے خواہ وہ اس کا مالک عید ہی کے دن ہوا ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرے، دیکھیے تو اسلام کی شانِ مساوات، خدمت انسانیت اور معاشرے میں توازن پیدا کرنے کی فکر، صدقہ فطر کا مقصد یہی تو ہے کہ جو غریب ہوں وہ بھی عید منائیں، جو کمزور ہوں ان کے بچوں کو بھی نئے کپڑے میسر آجائیں، جن کو دو وقت کی روٹی نصیب نہ ہو ان کے گھر بھی عید کے دن خوشی کا ماحول ہو اور وہ بھی اچھے پکوان کھائیں ــــ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ صدقہ فطر عید سے کچھ روز قبل ہی مستحقین تک پہنچادیا جائے، مشاہدہ تو یہ ہے کہ لوگ اس کی ادائیگی کے لیے عید کی آمد کا انتظار کرتے رہتے ہیں، ایک اور قابل تعجب بات یہ ہے کہ معلوم نہیں

کیوں ہمارے علماء ۲۵-۳۰ روپیہ پونے دو کلو گیہوں کی قیمت ادا کرنے کی ہی ترغیب دیتے ہیں اور زکوۃ فطر کا یہی نصاب بتاتے ہیں، ایک صاع کھجور یا ایک صاع کشمش (۳½ کلو) یا اس کی قیمت بتانے سے گریز کرتے ہیں، ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ تساہلی اور تغافل کے اس دور زوال میں اسی کی ادائیگی ہو جائے تو وجوب کی ادائیگی ہو ہی جائے گی ــــ کم از کم راقم کو بڑا تعجب ہوتا ہے اور بڑی حیرت ہوتی ہے کہ جن کی جیبیں بہت بھاری ہیں بلکہ جن کے بینک کے کھاتے بھی بوجھل ہیں اور جن کے ایک وقت کے ناشتہ وکھانے پر ہزاروں خرچ ہوتے ہیں وہ بھی ۲۵-۳۰ روپیہ پر قناعت کر جاتے ہیں انہیں کسی غریب کو یہ رقم دیتے ہوئے شرم نہیں آتی، بالخصوص جب ذہن میں ہو کہ اس رقم سے یہ بھی اپنی عید منا لے گا، سوچیے کسی گھر میں ۵ ارکان ہیں اور صاحب خانہ کی آمدنی لاکھوں میں ہے، صدقہ فطر ۲۵-۳۰ کے اعتبار سے سوا سو-ڈیڑھ سو روپیہ نکال دیا، یہ رقم جس کو دی جائے گی، اس کے گھر ٹھیک سے شیرینی بھی نہ پک سکے گی اس رقم کی بدولت چہ جائیکہ وہ کپڑے لائے اور عید کی خوشی میں شریک ہو، اس کے برخلاف یہی شخص اگر اپنی آمدنی کے لحاظ سے معمولی کھجور سو روپیہ فی کلو والی سے صدقہ ادا کرے تو کوئی ۱۷۵۰ روپیہ کی رقم ہوگی، اب یہ جس غریب کو دی جائے گی واقعی اس کے لیے سہارا بنے گی، غور کرنے کی بات ہے، صدقہ فطر کے نصاب میں سب سے زیادہ مقدار کھجور اور کشمش کی ہے اس لیے کی اس کی پیداوار وہاں زیادہ تھی اور اس کا حصول سب کے لیے آسان تھا، سب سے کم گیہوں کی مقدار رکھی گئی کیوں کہ اس معاشرہ میں یہ سب سے زیادہ نایاب تھا، آپ نے کبھی سنا کہ آپ ﷺ گیہوں کی روٹی تناول فرماتے تھے، آپ ﷺ اکثر و بیشتر تو جو کی روٹی تناول فرماتے تھے، ہمارے یہاں اس زمانے میں سب سے زیادہ اسی گیہوں کی پیداوار ہے، تینوں میں سب سے سستا و آسان یہی ہے اور ہم اسی سے اپنا بوجھ اتار لیتے ہیں۔ کیا ہی خوب ہو کہ مالدار طبقہ یہ عہد کرے کہ صدقہ فطر کی اس حکمت کو عام کیا جائے گا اور عید کے دن مساوات کے فروغ کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق صدقۂ فطر کے نصاب کو اختیار کیا جائے گا۔

قصہ مختصر رمضان کے روزے اگر واقعی رکھے گئے، زکوۃ بھی شرعی تعلیمات کے مطابق ٹھیک ٹھیک حساب کتاب کر کے ادا کی گئی، تراویح کی بھی پابندی کی گئی اور صدقہ فطر کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ رمضان کے اکثر اوقات کو رضائے الٰہی کی طلب اور عبادت پروردگار کے ساتھ حصول نجات کی غرض سے سنبھل سنبھل کر گزارا گیا تو پھر اس طرح گناہ معاف ہوں گے جس طرح حدیث میں تذکرہ ہے کہ رمضان کو جس نے ایمان واحتساب کے ساتھ گزارا تو اس کے گناہ اس طرح معاف کر دیے جائیں گے جیسے کہ آج ہی اس نے ماں کے پیٹ سے جنم لیا ہو ــــ اس کا صحیح اندازہ انسان خود رمضان گزر جانے کے بعد اپنے عمل سے کر سکتا ہے کہ اس نے خود کس قدر اثر قبول کیا اور اس کی عبادات، اس کے روزوں کے اس پر کس حد تک اثرات مرتب ہوئے، آمد رمضان کی مبارک باد قبول کیجیے، رحمت کی خوشخبری سنیے، رحمتوں کے حصول کی خاطر جھولیاں پھیلا لیجیے اور مغفرت کی خاطر بندگی کا عزم کر لیجیے، موقع غنیمت جانیے اور آگ سے خلاصی کا سامان کر لیجیے، تربیت نفس کی نیت سے رمضان کا استقبال کیجیے، رضائے الٰہی کی طلب میں رمضان گزاریے اور پھر روحانی و دنیاوی زندگی میں تبدیلی کا مشاہدہ کیجیے۔ اللھم وفقنا لما تحب وترضی

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

گوشۂ رمضان

روزہ ورمضان- اُحکام وفضائل

محمد قمر الزماں ندوی
جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ
maeducationalsociety@gmail.com

روزہ کی حقیقی و مشروعیت

روزہ مذہب اسلام کا ایک عظیم الشان رکن اور اہم عبادت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ چیزوں کو اسلام کی بنیاد بتایا ہے ان میں یہ بھی ہے۔قرآنِ مجید سے اس کی فرضیت اور اُہمیت ثابت ہے، روزہ کی اُہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی طرح دیگر ادیان و مذاہب کا بھی لازمی جز اور حصّہ رہا ہے، حتیٰ کہ ان اقوام میں بھی جن کا اہل کتاب ہونا قطعی طور پر ثابت نہیں ہے۔ روزہ کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے۔

رمضان المبارک کی فضیلت و أهميت

رمضان المبارک کا مہینہ انتہائی متبرک اور مبارک مہینہ ہے، یہ مہینہ برکتوں کا مہینہ ہے، جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور شیاطین قید کردیئے جاتے ہیں۔(حدیث)

رمضان سے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کی آخری تاریخوں میں بلیغ خطبہ دیا تھا، جس میں رمضان کا بھرپور تعارف ہے، اس اُہم اور بلیغ خطبہ کو ''منشور رمضان'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے ـــــ اس بلیغ خطبہ یا ''منشور رمضان'' کا ترجمہ یہ ہے:

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ماہِ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو (ہم لوگوں کو) ایک خطبہ دیا، اس میں آپؐ نے فرمایا: اے لوگو! تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے، اس مبارک مہینہ کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کئے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہِ خداوندی میں کھڑا ہونے (یعنی تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے) جو شخص اس مہینے میں اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے کوئی غیر فرض عبادت (یعنی سنت و نفل) ادا کرے گا تو اس کو دوسرے ایام کے فرضوں کے برابر اس کا ثواب ملے گا اور اس مہینہ میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے مہینوں کے ستر فرضوں کے برابر ملے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جس نے اس مہینہ میں کسی روزہ دار کو (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے لئے) افطار کرایا تو اس کے لئے گناہوں کی مغفرت اور آتشِ دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا، بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے ـــــ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ: یا رسول اللہ! ہم میں سے ہر ایک کو افطار کرانے کا سامان میسّر نہیں ہوتا (تو کیا غرباء اس عظیم ثواب سے محروم رہیں گے)؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا، جو دودھ کی تھوڑی سی لسّی پر یا صرف پانی ہی کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرادے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے ارشاد فرمایا کہ) اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلا دے، اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض (یعنی کوثر) سے ایسا سیراب کرے گا جس کے بعد اس کو کبھی پیاس ہی نہیں لگے گی تا آں کہ وہ جنت میں پہونچ جائے ـــــ (اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:) اور جو آدمی اس مہینہ میں اپنے غلام وخادم کے کام میں تخفیف

اور کمی کردے گا، اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادے گا اور اس کو دوزخ سے رہائی اور آزادی دے گا۔ (شعب الایمان للبیہقی)

روزہ کے سلسلے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو رمضان کے روزے ایمان واحتساب کے ساتھ رکھے اس کے گذشتہ گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔ (بخاری شریف)

رمضان کا ایک روزہ چھوڑنے کا نقصان: جو شخص شرعی عذر اور رخصت کے بغیر رمضان کا ایک روزہ بھی دانستہ چھوڑ دے تو وہ اس محرومی کا ازالہ ساری عمر کے نفلی روزوں سے بھی نہیں کرسکتا۔ اگرچہ فقہی مسئلہ کے اعتبار سے ایک روزہ کی قضا ایک ہی دن کا روزہ ہے، لیکن اس سے وہ برکات حاصل نہیں ہوسکتیں جو رمضان میں روزہ رکھنے سے حاصل ہوتی ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں صراحۃً حدیث منقول ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص رمضان کا ایک روزہ بھی بلا عذر شرعی (سفر اور مرض) چھوڑ دے، پھر مدت العمر روزے اس کی تلافی کے لئے رکھے تب بھی اس ایک روزہ کی کمی پوری نہ ہوگی۔'' (ترمذی)

روزہ کا حکم اور روزہ نہ رکھنے والوں کا حشر: ماہ رمضان کے روزے ہر عاقل، بالغ، مقیم اور تندرست مسلمان مرد وعورت پر فرض ہیں، بغیر کسی عذر کے ان کو چھوڑنا بہت بڑا گناہ ہے ایسے روزہ خوروں کا انجام آپؐ نے اس طرح بیان فرمایا کہ کل قیامت کے دن جہنم میں ایسے روزہ خور الٹے ٹانگ دیئے جائیں گے ان کے جبڑے پھاڑ دیے جائیں گے، ان سے خون بہہ رہا ہوگا، مارے درد کے ان کی چیخیں بلند ہورہی ہوں گی۔ (الترغیب والترہیب)

روزہ کی نیّت

نیت اصلاً دل کے ارادے کو کہتے ہیں، زبان سے چاہے کچھ کہا جائے یا نہ کہا جائے۔ لیکن زبان سے بھی کہہ لے تو اور بہتر ہے تاکہ دل اور زبان دونوں ایک ہوجائے۔ روزے کے لئے نیت شرط ہے، نیت یوں کرے: ''میں اللہ کی رضا کے لئے رمضان کا یہ روزہ رکھتا ہوں''۔ رمضان کے روزے کی نیت رات سے کرنا بہتر ہے اور اگر رات میں نیت نہ کی ہو تو دن کو زوال سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے تک نیت کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ کچھ کھایا پیا نہ ہو۔

سحری کا حکم اور اس کی فضیلت

روزہ رکھنے کی نیت سے جو کھانا صبح صادق سے پہلے کھایا جاتا ہے اسے سحری کہا جاتا ہے، سحری کھانا مستحب ہے، آپؐ نے فرمایا: سحری کھایا کرو کہ اس میں برکت ہے۔ ''**تسحروا فإنَّ في السحور بركة**'' (بخاری جلد-۱، ص:۲۵۷، باب برکۃ السحور) حضرت عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں امتیاز سحری کھانے سے ہے۔ (مسلم جلد-۱، صفحہ ۳۵۰، باب فضل السحور) ایک صاحب کو آپؐ نے سحری کی دعوت دی تو بلاتے ہوئے فرمایا کہ مبارک کھانے کی طرف آؤ — ''**هلم إلى الغذاء المبارك**'' (ابوداؤد، ۱/۳۲۰ باب من سمی السحور الغذاء)

چونکہ سحری کا مقصد روزہ میں تقویت حاصل کرنا ہے، اس لئے اس میں تاخیر مستحب ہے، ام المومنین حضرت عائشہؓ سے حضرت عبداللہ بن مسعود کی بابت کہا گیا کہ وہ افطار میں عجلت اور سحری میں تاخیر کرتے ہیں تو فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی فرمایا کرتے تھے۔ (مسلم ۱/۳۵۱، باب فضل السحور)

فقیہ ابو اللیثؒ سے منقول ہے کہ آخری حصّہ میں سحری کھائی جائے۔ (فتاوائے عالمگیری جلد ۱/صفحہ ۲۰۰) البتہ اتنی تاخیر نہ کی جائے کہ رات کا باقی ہونا مشکوک ہوجائے (بدائع الصنائع ۲/۱۰۵) سحری میں کوئی بھی چیز کھائی جاسکتی ہے، البتہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کھجور کھانا بہتر ہے، ''**نعم سحور المومن التمر**'' مومن کی بہترین سحری کھجور ہے۔ (ابوداؤد حدیث نمبر ۲۳۴۵)

روزے کو توڑنے والی چیزیں

جن چیزوں سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن سے صرف قضا واجب ہوتی ہے اور دوسری وہ جن سے قضا اور کفارہ دونوں واجب ہوتے ہیں۔

وہ صورتیں جن میں صرف قضا واجب ہے: جن صورتوں میں روزہ فاسد ہونے سے صرف قضا واجب ہوتی ہے، ان میں سے اہم صورتیں حسب ذیل ہیں۔

ا۔کان اور ناک میں دوا ڈالنا۔(۲) جان بوجھ کر منھ بھر کر قے کرنا، یا منھ میں ذراسی قے آئی اور اسکو دوبارہ قصداً نگل گیا۔(۳) روزہ یاد تھا لیکن کلی کرتے ہوئے حلق میں پانی چلا گیا۔(۴) مسوڑھوں سے خون نکلے اور اسے نگل لیا جائے ، البتہ خون بہت ہی معمولی مقدار میں ہو، جس کا ذائقہ بھی حلق میں محسوس نہ ہو تو پھر قضا واجب نہیں۔(۵) کوئی ایسی چیز کھالی جو نہ دوا ہے اور نہ غذا ہے، مثلاً لوہے یا لکڑی کا ٹکڑا یا کنکری وغیرہ نگل لی۔(۶) بھولے سے روزے میں کچھ کھا پی لیا اور پھر سمجھا کہ روزہ تو ٹوٹ ہی گیا ہے، اب کھانے میں کیا حرج ہے اور پھر خوب پیٹ بھر کر کھالیا۔(۷) غلط فہمی سے صبح صادق کے بعد سحری کھالی یا غروب آفتاب سے پہلے یہ سمجھ کر کہ سورج ڈوب گیا ہے، کچھ کھالیا۔(۸) بیڑی، سگریٹ اور حقّہ پینا۔اگر یہ عمل جان بوجھ کر کیا ہو تو قضا اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔ (۹) رمضان کے روزوں کے علاوہ کسی نفلی یا واجب روزے کو قصداً توڑ دینا۔(۱۰) لوبان اور عود (ایک لکڑی) وغیرہ کی دھونی سلگائی اور ان کا دھواں قصداً سونگھا تو اس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے، لیکن وہ عطر ،سینٹ اور خوشبو جس میں کوئی دھواں نہ ہو، روزے میں ان کا استعمال درست ہے اور انہیں سونگھنا بھی جائز ہے۔

قضا کے مسائل اور أحکام

(۱) مریض ، مسافر، یا کسی شخص کا روزہ قضا ہوگیا خواہ وہ شرعاً معذور نہ ہو، تو رمضان اور مکروہ ایام (عیدالفطر، عیدالضحیٰ اور ایام تشریق) کے علاوہ دنوں میں اس کی قضا اس پر لازم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔(**فمن کان منکم مریضا اوعلیٰ سفر فعدۃ من ایام اخر**)''پھر تم میں جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو اس پر دوسرے دنوں کا شمار رکھنا (لازم) ہے۔(سورہ بقرہ ۱۸۴)

(۲) اگر کسی وجہ سے روزہ قضا ہو جائے تو جیسے ہی وہ عذر ختم ہو تو اس کی قضا میں تأخیر نہیں کرنی چاہئے، جتنی جلدی ہو سکے اس کی ذمہ داری سے فارغ ہو جانا چاہئے۔(۳) قضا روزوں میں اسے اختیار ہے وہ مسلسل رکھے یا وقفے کے ساتھ۔اور سال کے جس دن بھی قضا کرنا چاہے کرسکتا ہے، صرف پانچ دن ایسے ہیں جن میں روزہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے (۴) اگر رمضان کے دوسال کے روزے رہ گئے ہوں تو قضا رکھنے میں یہ تعین ضروری ہے کہ وہ کس سال کے روزے رکھ رہا ہے، لیکن اگر یاد نہ ہو کہ کس رمضان کے کتنے روزے قضا ہوئے ہیں تو پھر یوں نیت کرے کہ ''سب سے پہلے رمضان کا پہلا روزہ جو میرے ذمہ ہے، اس کی قضا کرتا ہوں، رمضان کے مہینے میں کسی اور روزے کی نیت کرنا صحیح نہیں ہے۔اگر کوئی شخص کسی اور روزے کی نیت کرے، تب بھی وہ رمضان کا روزہ ہی شمار ہوگا۔(۶) قضا روزے رکھنے میں یہ ضروری ہے کہ صبح صادق سے پہلے نیت کر لی جائے۔اگر صبح صادق کے بعد نیت کی تو پھر یہ قضا کا روزہ نہ ہوگا بلکہ یہ نفلی روزہ ہو جائے گا اور قضا روزہ از سر نو رکھنا ہوگا۔

روزہ کی قضا پر قدرت کے باوجود فدیہ دینا: بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت فدیہ ادا کردے تو روزہ کی قضا اس کے ذمہ ضروری نہیں ہے، گو قضا کرنے کی قدرت رکھتی ہو، یہ خیال اور تصور سراسر غلط ہے، حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت اگر رمضان کے بعد روزہ رکھنے پر قادر ہو گئیں، تو ادا کردہ فدیہ باطل ہو جائے گا اور روزہ کی قضا لازم ہوگی یہی حکم تمام معذورین کا ہوگا یعنی روزہ کی قضا پر قدرت کے باوجود فدیہ دینا کافی نہ ہوگا۔(تفصیل تاتارخانیہ اور بدائع میں دیکھی جاسکتی ہے)

اگر قضا روزہ نہ رکھ سکا اور بوڑھا ہو گیا: اگر کسی کے ذمہ رمضان کے روزوں کی قضا باقی تھی، اور کئی سال گزر گئے اور وہ شخص قضا نہ کرسکا، اور اب وہ بوڑھا ہو چکا ہے، اس میں روزہ رکھنے کی طاقت اور سکت باقی نہیں ہے، ایسے شخص کے ذمہ جتنے روزے باقی ہیں، پورے کا حساب کرکے ہر ہر روزہ کا فدیہ ادا کردے، کیونکہ جو روزہ کی قضا پر فی الحال قدرت نہ رکھتا ہو، اور نہ ہی آئندہ قدرت بحال ہونے کا امکان ہو، جیسے شیخ فانی وغیرہ، تو اس کے لئے فدیہ ہی ہے،(مستفاد درمختار ۲/۴۲۷) اور اگر فدیہ ادا کرنے کی قدرت بھی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ سے برابر استغفار کرتا رہے اور اگر مرنے سے پہلے فدیہ کی ادائیگی پر جس قدر بھی قدرت حاصل ہو جائے تو اتنا فدیہ ادا کردے۔

قضا اور کفارہ کی صورتیں

رمضان کے روزے میں مندرجہ ذیل امور میں سے کوئی پیش آجائے تو قضا اور کفارہ دونوں واجب ہونگے (کفارہ کے لفظی معنی چھپانے کے ہیں اور شریعت میں کسی گناہ کو چھپانے یا مٹانے کے لئے جو چیز دی جاتی ہے اس کو کفارہ کہتے ہیں)

(۱) رمضان کا روزہ رکھ کر قصداً کوئی ایسا کام کرنا جس کا کرنا روزہ میں منع ہے۔مثلاً کھانا پینا یا عورت کے ساتھ اپنی خواہش پوری کرنا۔(کھانے میں یہ بھی شامل ہے کہ منھ کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے قصداً معدہ یا دماغ میں کوئی غذا پہنچا دی جائے، اس میں کفارہ تو نہیں مگر قضا واجب ہوگی۔) اسی طرح پینے میں پانی، دوا یا کوئی اور پتلی چیز کے علاوہ حقّہ، سگریٹ، بیڑی وغیرہ بھی شامل ہیں۔اگر ان چیزوں کا کوئی استعمال کریگا تو کفارہ دینا ہوگا۔

(۲) جان بوجھ کر ایسا کوئی فعل کیا جس سے روزہ فاسد تو نہیں ہوتا لیکن اس غلط فہمی میں روزہ توڑ دیا کہ ایسا کر لینے سے روزہ فاسد ہو جا تا ہے، مثلاً روزے میں سرمہ لگایا اور پھر یہ سمجھا کہ اس سے روزہ ٹوٹ گیا ہے، پھر کچھ کھا پی لیا تو اس صورت میں قضا اور کفارہ دونوں واجب ہونگے۔یہاں دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

(۱) ایک یہ کہ اگر اسکو کسی عالم نے غلط فتویٰ بتا دیا اور اس نے روزہ توڑ ڈالا تو پھر کفّارہ لازم نہیں آئے گا۔(۲) دوسرے یہ کہ یہ کام اگر ایسا تھا جس میں بظاہر یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، مثلاً اس نے بھول کر پیٹ بھر کھا لیا، یا عورت سے بغلگیر ہوا اور منی نکل آئی۔اب یہ خیال کر کے کہ میرا روزہ ٹوٹ گیا پھر دوبارہ کھا پی لیا تو اس صورت میں بھی کفارہ لازم نہیں آئے گا۔لیکن اگر یہ کام قصداً (جان بوجھ کر) کریگا تو جیسا کہ اوپر ذکر آیا قضا اور کفارہ دونوں ادا کرنا پڑے گا۔(علم الفقہ حصہّ سوم)

کفارہ کے أحکام

(۱) ''کفارہ'' صرف رمضان کا روزہ توڑنے سے واجب ہوتا ہے رمضان کے علاوہ کوئی بھی روزہ فاسد ہوجائے یا قصداً فاسد کر دیا جائے تو کفارہ واجب نہیں ہوتا، صرف قضا واجب ہوتی ہے۔رمضان کا روزہ توڑا جائے تو ''قضا اور کفارہ'' دونوں واجب ہوتے ہیں۔

(۳) رمضان کا روزہ توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کیا جائے، اگر اس کی طاقت نہ ہو یا اس کا رواج نہ ہو تو جیسا کہ ہمارے زمانہ میں (موجودہ زمانہ میں) غلاموں کا رواج نہیں ہے تو پھر ساٹھ روزے مسلسل رکھنا واجب ہیں۔اگر کسی وجہ سے درمیان میں ایک بھی چھوٹ گیا تو پھر نئے سرے سے ساٹھ روزے رکھنے واجب ہونگے، البتہ عورت کے ''ایام مخصوصہ'' سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا، جیسے ہی ماہواری کے دن ختم ہوں گے تو سابقہ ترتیب کے مطابق یہ عورت اپنے بقیہ کفارے کے روزے پورے کر لے۔

اور جو شخص کسی وجہ سے روزے بھی نہ رکھ سکتا ہو وہ ساٹھ مسکین کو دو وقت کا کھانا پیٹ بھر کر کھلائے یا ہر مسکین کو صدقۂ فطر کی مقدار کے برابر غلّہ یا اس کی قیمت دے دے۔

ایک ہی مسکین کو بیک وقت ساٹھ دنوں کا غلّہ یا اس قیمت دینا درست نہیں ہے۔اگر دے دیا تو صرف ایک دن کا کفارہ شمار ہوگا۔ہاں اگر ایک ہی دن میں ساٹھ مسکینوں کو غلّہ یا اس کی قیمت دینا جائز ہے۔

(۴) کفارہ کے روزے دو ماہ پے در پے رکھنے ضروری ہیں (گو درمیان میں مکروہ وقت آ جائے جیسے عید الأضحیٰ اور ایام تشریق) لہٰذا اگر درمیان میں ایک دن بھی روزہ توڑ دیا یا نہیں رکھا تو پھر شروع سے رکھنا پڑے، اس سے صرف حیض کی مدت مستثنیٰ (الگ) ہے۔

روزہ کا فدیہ

قرآن مجید نے روزہ کی نسبت سے فدیہ کا صراحتاً ذکر فرمایا ہے، ارشاد خداوندی ہے۔**وعلی الذین یطیقون فدیة طعام مسکین** (البقرہ۱۸۴) جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہوں، ان پر بھی فدیہ یعنی ایک مسکین کا کھانا ہے۔

اس آیت کی روشنی میں جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ بہت دراز عمر شخص جو روزے رکھنے سے عاجز ہو اور جس کا ہر دن اس کو موت سے قریب تر کرتا جاتا ہو، روزہ نہ رکھ کر فدیہ ادا کر سکتا ہے۔فدیہ واجب ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ روزہ رکھنے سے دائمی طور پر عاجز و بے بس ہو، اسی طرح جو مر چکا ہو اور اس کے ذمہ رمضان کے روزے باقی رہ گئے ہوں، ہاں اگر کوئی شخص وقتی عذر کی وجہ سے رمضان کا روزہ نہ رکھ سکے، تو اس کے لئے عذر دور ہونے کے بعد روزہ کی قضا کرنی ضروری ہوگی۔فدیہ ادا کرنا کافی نہیں ہوگا۔(فتح القدیر:۲/۳۵۷)

جوشخص روزہ بھی نہ رکھ سکتا ہواوراس کے پاس فدیہ ادا کرنے کے لئے بھی کچھ نہ ہو وہ صرف استغفار کرتا رہے اور نیت رکھے کہ جب بھی اس کے پاس مال آئے وہ روزے کا فدیہ ادا کردے گا۔

فدیہ کی مقدار

روزے کا فدیہ اصلاً یہ ہے کہ ایک مسکین کو دو وقت (دوپہر اور رات) کا کھانا کھلانا ہے اور قرآن مجید میں اس کا ذکر آیا ہے۔لیکن اگر اس کے بجائے محتاج کو غلّہ ہی دیدے تو اس کی بھی گنجائش ہے، اگر غلّہ دینا ہو تو امام ابوحنیفہؒ کے یہاں صدقۂ فطر کی مقدار دینا ضروری ہے، لیکن کھجور اور جَو دینا چاہے تو ایک صاع اور گیہوں دینا چاہے تو نصف صاع، (۱۰۵۹۰ کلوگرام آج کے وزن کے مطابق) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کا اصل منشا اطعام طعام (کھانا کھلانا) ہے لہٰذا سنت سے قریب اور افضل مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا، اور یہ بات بھی واضح رہے کہ فدیہ ادا ہونے کے لئے تملیک (فقیر کو مالک بنانا) ضروری نہیں ہے بلکہ مباح کرنے سے بھی فدیہ ادا ہوجائے گا۔ جیسے مساکین کو بیٹھا کر کھلائیں۔(رمضان کے شرعی احکام صفحہ ۲۵۰)

روزہ میں مکروہ اُمور

روزے میں مندرجہ ذیل امور مکروہ اور ناپسندیدہ ہیں:

(۱) بلا وجہ منھ میں تھوک جمع کر کے نگلنا (۲) ٹوتھ پیسٹ یا منجن سے دانت صاف کرنا۔(۳) بے قراری اور گھبراہٹ وغیرہ کا بار بار (روزہ میں) اظہار کرنا۔(۴) غیبت، گالی گلوج، ہنگامہ، ظلم اور زیادتی وغیرہ کرنا۔کلّی کرنے یا ناک میں پانی ڈالنے میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ کرنا۔(۵) پانی میں دیر تک رہنا یا دیر تک غسل کرتے رہنا، خواہ حمام میں ہو یا باہر۔(۶) بلا عذر روزہ دار عورت کے لئے بچہ کے واسطہ یا کسی بھی غرض کے لئے کوئی چیز چبانا، یا کھانے کی لذت معلوم کرنے کے لئے شوربہ چکھنا۔اسی طرح عام روزہ دار کا کسی چیز کا چکھنا۔(۷) پچھنا لگانا اس وقت جبکہ روزہ دار کو روزہ رکھنے میں ضعف پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔(۹) کسی چیز کا منھ میں ڈالے رکھنا، یا چبانا خواہ وہ کھانے کی چیز ہو یا کھانے کی چیز نہ ہو کیونکہ ایسی صورت میں حلق کے نیچے اتر جانے کا اندیشہ ہے۔(۱۰) غسل واجب ہو، لیکن صبح صادق طلوع ہونے کے بعد بھی نہ نہانا اور بلا عذر تاخیر کرنا۔

روزہ میں مباح کام

مندرجہ ذیل امور روزہ میں جائز ہیں، ان سے نہ روزہ ٹوٹتا ہے اور اور نہ ہی یہ مکروہ ہیں۔

(۱) بھولے سے کھا پی لینا۔(۲) روزے میں ضروری غسل کی حاجت ہو جائے، تو اس سے روزے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ جتنی جلد ہو سکے اسے غسل کر لینا چاہئے اور اس بات کا اہتمام رہے کہ غرغرہ نہ کرے۔(۳) سر، داڑھی اور مونچھوں پر تیل لگانا۔(۴) آنکھ میں دوا یا سرمہ ڈالنا۔(۵) خوشبو سونگھنا۔(۶) کان میں پانی چلا جائے۔(۷) قصداً قے کی لیکن منھ بھر کر نہیں یا بے اختیار منھ بھر کر قے ہو جائے تو اس سے روزہ میں کوئی فساد نہیں آتا۔(۹) بے اختیار حلق میں دھواں، گرد و غبار یا مکھی چلی جائے۔(۱۰) مسواک کرنا، خواہ مسواک بالکل تازہ ہی ہو اور اس کی کڑواہٹ بھی منھ میں محسوس ہو، اور اگر مسواک کا کوئی ریشہ حلق میں چلا جائے تو اس سے بھی روزے میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔(۱۱) گرمی کی شدت سے کلّی کرنا، منھ دھونا، نہانا، یا تر کپڑا سر یا بدن پر رکھنا۔(۱۲) دانت سے بہت معمولی مقدار میں خون نکلے، جس کا اثر حلق میں نہ جائے تو اس سے بھی روزے میں کوئی خلل نہیں آتا۔

روزہ نہ رکھنے کی اجازت

جن عذروں (مجبوریوں) کی وجہ سے ایک مسلمان کو رمضان کے روزے نہ رکھنے یا توڑ دینے کی اجازت ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) سفر: یعنی اگر کوئی شخص شرعی سفر پر ہو (یعنی اگر کوئی شخص ۴۸ میل (۷۴ کلومیٹر) سے زیادہ کر سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو) خواہ پیدل ہو یا سواری سے اسے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔لیکن اگر سفر میں کوئی تکلیف اور دشواری نہ ہو تو روزہ رکھ لینا بہتر ہے تاکہ رمضان کی فضیلت حاصل ہو جائے اور اگر روزہ رکھ کر سفر شروع کیا جائے تو پھر اسے پورا کرنا ضروری ہے، ہاں اگر سفر شروع کرنے کے بعد کوئی شدید مجبوری آ جائے تو پھر روزہ توڑ سکتے ہیں۔

(۲) مرض: اگر کوئی شخص ایسا مریض ہو کہ وہ روزہ رکھے گا تو اس کا مرض بڑھ جائیگا، یا کوئی نیا مرض پیدا ہو جائے گا، یا اس کے اچھے

ہونے میں دیر لگے گی تو اس کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے، یا مرض تو نہیں ہے لیکن کمزوری اتنی ہے کہ روزہ رکھے گا تو پھر بیمار ہو جائے گا تو اس کو بھی روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔ لیکن مرض کی صورت میں اسی وقت روزہ چھوڑنا چاہئے جب کوئی نیک محتاط مسلمان ڈاکٹر یا حکیم اس کو روزہ چھوڑنے کا مشورہ دے یا خود آدمی کو پورا یقین ہو، یا تجربہ ہو کہ روزے سے اس کو نقصان پہنچے گا ۔(اسلامی فقہ جلد اول صفحہ ۳۸۷۔۳۸۸)

(۳) حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی): جو عورت حاملہ ہو یا دودھ پلاتی ہو اس کو اگر اپنی جان یا بچے کی جان کا خطرہ ہو یا اس بچہ کو سخت تکلیف میں پڑ جانے کا یقین ہو تو اس کو روزہ چھوڑ دینا جائز ہے ،مثلاً روزے دار حاملہ عورت کو بیہوشی کی کیفیت ہو جاتی ہو، یا اس کا دودھ خشک ہو جاتا ہو اور بچہ بھوک سے تڑپتا ہو۔

(۴) حیض ونفاس: حیض ونفاس کی حالت میں عورت سے روزہ معاف ہے، لیکن جب وہ پاک ہو گی تو اس پر ان روزوں کی قضا ضروری ہے، حیض ونفاس میں چھوٹی ہوئی نماز تو معاف ہے مگر روزہ معاف نہیں ہے۔

ان تمام صورتوں میں (سوائے حیض ونفاس) جتنے دن روزہ چھوڑ اجائے اتنے ہی دنوں کی بعد میں صرف قضا ضروری ہے، ان میں کفارہ واجب نہیں ہے۔

روزہ رکھ کر توڑ دینے کی اجازت

چند صورتیں ایسی ہیں جن میں روزہ دار روزہ رکھ کر بھی روزہ توڑ سکتا ہے اور وہ گنہگار بھی نہیں ہو گا۔ مثلاً اگر کسی کو روزہ رکھ لینے کے بعد اتنی شدید پیاس لگی یا اتنی بھوک لگی کہ اگر روزہ نہ توڑا تو اس کی جان چلی جائے گی یا اس پر بیہوشی طاری ہو جائے گی، کوئی اور مرض پیدا ہو جائے گا، یا مرض بہت بڑھ جائے گا، تو اس حالت میں روزہ توڑ دینا جائز ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو تیز بخار آ گیا، پیٹ میں یا گردہ میں یا کان میں شدید درد ہوا، اب اگر وہ دوا نہیں کھاتا یا پیتا ہے تو اس کا بخار یا درد اچھا نہیں ہو گا تو اس کو دوا پی کر روزہ توڑ دینے کی اجازت ہے۔ اسی طرح اگر کسی کسان نے دھوپ میں ہل یا پانی چلایا، یا مزدور نے اپنی اور اپنے بچوں کی پرورش کے لئے دھوپ میں محنت مزدوری کی اور اسکو اتنی پیاس لگ گئی کہ وہ روزہ نہیں توڑے تو بیہوش ہو جائے گا تو اس کو روزہ توڑ دینے کی اجازت ہے۔

افطار اور اس کی دعا

سورج ڈوبنے کے بعد روزہ ختم کرنے کے خیال سے جو کچھ کھایا پیا جاتا ہے، اسکو شریعت میں افطار کہتے ہیں، جس طرح سحری میں دیر کرنا ثواب ہے اسی طرح افطار میں جلدی کرنا ثواب ہے، چنانچہ حضرت سہل بن سعدؓ سے مروی ہے "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قَالَ: لا يزال الناس بخير ما عجلوا الفطر" "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمیشہ لوگ خیر سے رہیں گے جب تک جلد روزہ کھولا کریں گے"۔(بخاری باب تعجیل الافطار:۱؍۲۶۳)

جلدی کا مطلب یہ ہے کہ جوں ہی اس بات کا یقین ہو جائے کہ سورج غروب ہو گیا فوراً روزہ افطار کر لینا چاہئے ۔ یہ انتظار نہ کرنا چاہئے کہ ذرا اندھیرا ہوا جائے۔

افطار کرنے سے پہلے یہ دعا پڑھنے چاہئے۔" اللهم لک صمت وعلى رزقک أفطرت " اے اللہ میں نے تیرے لئے روزہ رکھا اور تیری دی ہوئی رزق سے افطار کیا۔

اور افطار کرنے کے بعد یہ دعا پڑھی چاہئے۔" ذَهَبَ الظمأُوَابتَلّتْ العُرُوقُ وَثَبَتَ الأجرانْ شاءَ اللّٰهُ" پیاس جاتی رہی اور رگیں تر ہو گئیں اور اللہ نے چاہا تو اس کا اجر بھی ملا۔

پہلے افطار کس چیز سے کیا جائے؟

دسترخوان پر افطار کے وقت انواع واقسام (قسم قسم) کی چیزیں ہوتی ہیں، ایسی صورت میں افضل یہ ہے کہ سب سے پہلے تر کھجور سے افطار کرے، اگر تر کھجور نہ ہو تو خشک کھجور سے افطار کرے، اگر دونوں میں سے کوئی نہ ہو تو پانی سے افطار کرے۔

غیر مسلموں کی افطار پارٹی میں شرکت کا حکم: اگر غیر مسلم پاک اور حلال چیزیں پاک صاف برتن میں افطار پارٹی میں پیش کریں تو غیر مسلموں کی افطار پارٹی میں شرکت کرنا بھی جائز ہوگا، فقہاء نے غیر مسلموں کی دعوت قبول کرنے کو جائز قرار دیا ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی کی دعوت قبول فرمائی ہے۔ البتہ غیر مسلموں کی افطار پارٹیوں کا عام افطار پارٹیوں سے حتی الامکان بچنے ہی کی کوشش کرنے میں روزہ کا صحیح فائدہ مل سکتا ہے،

کیونکہ غروب کا وقت جو افطار کا وقت ہوتا ہے وہ دعا کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے، اور ایسی پارٹیوں میں عام طور پر لوگوں کو دعا کی کیا توفیق ملے گی، مغرب کی نماز بھی اکثر لوگوں کی فوت ہوجاتی ہے۔

افطار کی وجہ سے جماعت میں تاخیر

افطار کی وجہ سے مغرب کی نماز میں کچھ دیر کرنا جائز ہے اس میں کچھ حرج نہیں ہے، اطمینان سے روزہ افطار کرکے اور پانی پی کر اور کچھ کھا کر جو موجود ہو، نماز پڑھنی چاہئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز سے پہلے چند تازہ کھجوروں سے افطار فرماتے تھے، اس لئے فقہاء نے عام طور پر جماعت مغرب میں پانچ سات منٹ کی تاخیر کی گنجائش رکھی ہے۔

کن لوگوں کے لئے روزہ داروں سے مشابہت واجب ہے؟: جو لوگ روزہ سے نہ ہوں، بعض صورتوں میں ان پر روزہ داروں کی مشابہت اختیار کرنی پڑتی ہے، اور کھانے، پینے سے اجتناب برتنا واجب ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں اس طرح کی مشابہت واجب نہیں۔

بیمار، بیماری کی وجہ سے یا مسافر سفر کی وجہ سے روزہ نہیں رکھے تو اس پر روزہ داروں کی طرح بھوکا پیاسا رہنا واجب نہیں، یہی حکم اس عورت کے لئے ہے جو حیض یا نفاس کی حالت میں ہو۔

اگر دن کے درمیان عورت پاک ہوئی، یا مسافر اپنے گھر آ گیا تو دن کے اختتام تک اس کو خورد ونوش سے باز رہنا چاہئے، اسی طرح کسی کا روزہ خطاءً (بھول سے) ٹوٹ گیا جیسے کلّی کر رہا تھا کہ پانی حلق میں چلا گیا، یا قصداً روزہ توڑ دیا، یا تیس (۳۰) شعبان کی صبح کو کھالیا اور بعد کو معلوم ہوا کہ آج رمضان ہے تو ان تمام صورتوں میں روزہ داروں کی مشابہت اختیار کرنا اور دن کے بقیہ حصہ میں کھانے پینے سے اجتناب کرنا واجب ہوگا۔ (قاموس الفقہ، ج-۴، صفحہ ۳۰۱)

نماز تراویح کا حکم

رمضان کے مہینے میں عشاء کی فرض اور سنت کے بعد تمام بالغ، مقیم اور تندرست مسلمان مرد وعورت پر بیس رکعت نماز تراویح پڑھنا ''سنت مؤکدہ'' ہے البتہ عورتوں کو یہ نماز گھر میں پڑھنی چاہئے اور مردوں کو مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کرنا سنت ہے، اگر کسی محلے یا گاؤں کی مسجد میں کوئی شخص بھی نماز تراویح جماعت سے نہ پڑھے، تو پورے محلے اور گاؤں والے سنت چھوڑنے کی وجہ سے گنہگار ہوں گے۔ (عالمگیری ۱/۱۱۶)

نماز تراویح کی رکعات

نماز تراویح کی رکعات کی تعداد کیا ہے؟ اس کی تصریح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً یا فعلاً کسی صحیح اور معتبر حدیث سے ثابت نہیں ہے، اتنی بات تو درست ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن تراویح کی جماعت کرائی، لیکن اس میں کتنی رکعتیں پڑھائیں، اس کا ذکر صحیح روایت میں نہیں آتا، اور بعد میں آپؐ نے اس اندیشے سے جماعت ترک فرمادی کہ کہیں امّت پر یہ نماز لازم اور ضروری نہ کردی جائے۔

جن روایات میں آٹھ رکعات کا ذکر ہے، وہ نماز تراویح سے متعلق نہیں بلکہ تہجد سے متعلق ہیں، اس لئے اس طرح کی روایات سے نماز تراویح کی آٹھ رکعات پر استدلال کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ یہ نماز الگ الگ پڑھا کرتے تھے اور کبھی کبھی دو دو، چار چار آدمی جماعت کر لیتے تھے۔ باقاعدہ جماعت کا رواج خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں ہوا۔

نیز حضرت عمر فاروقؓ نے صحابہ کے مشورہ سے نماز تراویح کی بیس رکعتیں مقرر فرمائیں، اسی وجہ سے چاروں ائمہ فقہ وحدیث (امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد حنبلؒ) اور تمام مجتہدین ومحدثین جماعت کے ساتھ بیس رکعات تراویح کے سنت مؤکدہ ہونے پر متفق ہیں۔

نیز حضرت عمر فاروقؓ جس وقت صحابہ کرامؓ کے مشورے سے نماز تراویح کی بیس رکعتیں مقرر فرمائیں، اس وقت صحابہ کرامؓ کی بہت بڑی تعداد موجود تھی، ان میں سے کسی نے بھی حضرت عمر کے اس عمل پر مخالفانہ اقدام نہیں کیا بلکہ اس پر عمل بھی کیا اور اس کے بعد تمام صحابہ وتابعین اسی پر عمل کرتے چلے آئے، یہ اس کہ واضح دلیل ہے کہ صحابہ کرامؓ کا بیس رکعت پر ''اجماع'' منعقد ہوگیا تھا۔ اگر بیس رکعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ ہوتیں تو حضرت عمرؓ سے زیادہ بدعات کا دشمن کون ہوسکتا تھا؟ اور اگر بالفرض ان سے

کوئی غلطی ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ ولیہ وسلم کی سنت پر جان دینے والے صحابہ کرامؓ اس کو کیسے گوارہ کر سکتے تھے؟ یقیناً ان حضرات کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول فعل موجود ہوگا، جو ہم تک صحیح سند کے ساتھ نہیں پہونچ سکا۔

ایک روایت میں نبی کریم صل اللہ علیہ وسلم سے بیس رکعات تراویح پڑھنا ثابت ہے، گو وہ حدیث ضعیف ہے، لیکن خلفاء ثلاثہ اور صحابہ کرام کے مسلسل عمل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی نے امام رافعیؒ کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ "آنحضرتؐ نے صحابہؓ کو دو رات بیس بیس رکعتیں پڑھائیں، پھر جب تیسری رات ہوئی تو لوگ جمع ہوئے مگر آنحضرتؐ تشریف نہ لائے، پھر صبح کو فرمایا کہ "مجھے اندیشہ ہوا کہ تم پر فرض ہوجائے گی تو تم اسے نبھا نہ سکو گے"۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرمایا: "متفق علی صحتہ" اس حدیث کی صحت پر تمام محدثین کا اتفاق ہے" (تلخیص الحبیر: ۱۱۹/۱)

حضرت امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ "یقینی طور پر یہ ثابت ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ رمضان المبارک میں لوگوں (صحابہؓ و تابعینؒ) کو بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھاتے تھے، لہٰذا اکثر علماء نے بیس رکعت ہی کو سنت نبوی قرار دیا ہے، کیونکہ وہ حضرات مہاجرین و انصار کی موجودگی میں بیس رکعت پڑھاتے تھے اور کسی نے بھی ان کے اس فعل پر انکار و اعتراض نہیں کیا"۔ (عون الباری، ۳۰۴/۴)

مشہور اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خاں بھوپالیؒ کا عقیدہ ہے کہ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جو طریقہ بیس رکعت کا ہوا، اس کو علماء نے اجماع کے مثل شمار کیا ہے"۔ (عون الباری: ۳۰۴/۴)

ان تمام روایات اور علماء کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ تراویح کی بیس رکعت ہی سنت ہے، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے ثابت اور ان کی سنت ہے، اور ارشاد نبوی ہے کہ "جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا، وہ بڑے اختلافات دیکھے گا (ایسی حالت میں) تم اپنے اوپر میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو لازم کر لینا، اس کی پیروی کرنا اور مضبوطی سے اس کو تھام لینا۔ (ابوداؤد کتاب السنہ حدیث نمبر ۴۶۰۹)

ایک یا تین یا سات راتوں میں قرآن کریم ختم کرنا

اگر ایک یا تین یا سات راتوں میں تراویح کے اندر قرآن کریم اس طرح ختم کیا جائے کہ وہ تجوید کے مطابق ہو، الفاظ کی ادائیگی بالکل صحیح ہو حروف کاٹ کر نہ پڑھے جائیں، صرف یعلمون تعلمون سنائی نہ دے بلکہ قرآن کریم سننے والوں کو لفظ بلفظ سمجھ میں آئے اور نمازی خوش دلی سے اس میں شریک ہوں تو اس طرح ختم کرنا جائز ہے، شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر قرآن کریم صاف اور صحیح طریقے سے نہ پڑھا جائے، حروف کٹنے لگیں اور یعلمون تعلمون ہی سنائی دے جیسا کہ بعض علاقوں میں صورتحال بالکل اسی طرح ہے تو پھر اس طرح پڑھنا درست نہیں ہے، اس سے اجتناب کرنا لازم ہے، یہ قرآن مجید کی سراسر بے ادبی ہے۔ (فقہی رسال ۲۸۴:۱)

تراویح کے چند ضروری أحکام

(۱) نماز تراویح میں ایک بار پورا قرآن مجید ختم کرنا سنت ہے۔ (۲) ختم قرآن کے موقع پر حافظ کو رقم وغیرہ دینا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، البتہ حافظ لقمہ دینے کے لئے جو سامع ہوا سے رقم وغیرہ دینا اور اس کا لینا جائز ہے۔ (امدادالفتاویٰ ۳۲۹:۱)

(۳) نماز تراویح کی جماعت شروع ہوچکی تھی، تو اسے چاہئے کہ پہلے عشاء کی فرض اور سنتیں پڑھے پھر تراویح کی جماعت میں شریک ہو، اس دوران جتنی رکعتیں تراویح کی رہ جائیں، انہیں وتر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے سے پہلے پورا کیا جائے۔ (۵) نابالغ کو نماز تراویح میں امام بنانا جائز نہیں۔ (۶) اگر کسی شخص کی داڑھی ایک مشت سے کم ہو یا وہ منڈواتا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا خواہ تراویح کی ہو مکروہ تحریمی ہے (۷) اگر نماز تراویح کی کچھ رکعتیں فاسد ہوجائیں تو جب ان کو دوبارہ پڑھا جائے گا تو ان رکعتوں میں جس قدر قرآن مجید پڑھا گیا ہے اس کو بھی دوبارہ پڑھنا ہوگا تاکہ پورا قرآن مجید صحیح نماز میں ختم ہو۔

☆☆☆

خاص تحریر

عہدِ نبوی کا نظامِ تعلیم و تربیت

مجیب الرحمٰن عتیق
مدیر مرکز الامام ابی الحسن جامعہ سید احمد شہید لکھنؤ

تعلیم انسان کا زیور اور اس کا امتیازی وصف ہے، تعلیم انسان کو شعور و آگہی فراہم کرتی ہے، زمین کی پستیوں اور حیوانی جبلتوں سے نکال کر آسمان کی بلندیاں اور ملکوتی صفات عطا کرتی ہے، انسانی زندگی میں تعلیم کی ضرورت و اہمیت ایک مسلم حقیقت ہے، اسلام ہی دنیائے انسانیت کا پہلا و آخری وہ مذہب ہے جس نے جہالت کے اندھیروں میں علم کی شمع فروزاں کی، علم و اہل علم کی قدر افزائی کی، اور علم کی حقیقی روح سے روشناس کرایا، علم کا مقدس رشتہ علام الغیوب سے جوڑا، تعلیم کی اہمیت پر خاص زور دیا، اسلام نے علم حاصل کرنے کی نہ صرف یہ کہ دعوت دی بلکہ ہر شخص کا فرض قرار دیا، اسلام میں صرف عقائد وعبادات کے مجموعہ کا نام علم نہیں ہے، بلکہ آسمان وزمین، شمس وقمر، کواکب وسیارے، نظام شب وروز، باد وباراں، برق وطوفاں، بحر وبر، صحراء وکوہسار، جمادات ونباتات، غرض کون سی چیز ہے جس کا مطالعہ کرنے کی ترغیب اسلام نے نہیں دی، جھرنوں اور آبشاروں، کہکشاں وفضائے بسیط سے لیکر پھول کی پتی، اور ذروں کا جگر چیر کر نظام قدرت وربوبیت کے مشاہدے کی دعوت دی ہے، ان پڑھوں اور ناخواندوں میں جہالت کے خلاف اعلان جنگ پہلی وحی کے ذریعہ ہی کیا ہے، اگر تاریخ کا مطالعہ تعصب وتنگ نظری کے بجائے بصیرت وحق پسندی سے کیا جائے تو شاید ہی کوئی کوتاہ بیں ہوگا جو اس کا اعتراف نہ کرلے، حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا کا نازل کردہ وہ آخری دین ہے جو کامل ومکمل تہذیب بھی ہے، اور انسانوں کے لئے ضابطۂ حیات (Syestem of Life) بھی، وہ عقائد وعبادت کا مجموعہ بھی ہے اور قیام عدل ومیزان کی شمشیر آبدار بھی، آج دنیا کو علم وتہذیب کا درس دینے والے مغرب زدہ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے ہی دنیا کو علم وتمدن اور وسائل تعلیم سے آشنا کرایا ہے، انھوں نے علمی میدان میں اتنی ترقی کی ہے کہ آج پوری دنیا ان کے علم، نصاب تعلیم، نظام تعلیم وتربیت کا نہ صرف لوہا ماننے پر مجبور ہے بلکہ اسکو اختیار کئے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا، اور افسوس تو یہ ہے کہ اس صف میں غیروں کے ساتھ کچھ اپنے بھی معذرت خواہانہ انداز میں دست بستہ کھڑے ہیں، ہم ذیل کے سطور میں مختصراً یہ ثابت کریں گے کہ یورپ علم یا نظام تعلیم وتربیت کا موجد نہیں ہے بلکہ پیروانِ اسلام کی متاعِ گم شدہ کو اس نے حاصل کر لیا ہے اور اہلِ حق اپنی متاعِ اقبال سے غافل ہیں ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل

اقبال کے قلب دردمند اور سوز دروں نے کچھ یوں کہا ہے ؎

وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اسلام کا نظریۂ علم:

اسلام کا پہلا سبق علم کے تذکرے سے شروع ہوتا ہے، جب غارِ حرا میں حضور ﷺ پر وحی کا نزول شروع ہوا، تو اچانک جہالت کی شبِ دیجور کے درمیان آفتابِ علم اس شان سے طلوع ہوا، کہ حکم دیا گیا "إقرأ باسم ربك الذي خلق، خلق الإنسان من علق" دنیائے انسانیت کے بڑے بڑے فلسفیوں کے نظریات کے مقابلے میں یہ امتیاز صرف مذہبِ اسلام کو ہی حاصل ہے، اس نے علم کی شمع روشن ہی نہیں کی، بلکہ اس کے رشتہ کو تقدسِ خدا کے ساتھ

جوڑ دیا، اس سے آگے بڑھکر یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم کا بنیادی موضوع آفاق وانفس میں خدائے ذوالجلال وخالق انسانیت کی تلاش وجستجو، اس کی ربوبیت وخلاقیت کے بکھرے ہوئے مظاہر کوقرار دیا، محض ظن و تخمین اور ناقص تجربات کے ذریعہ مادیت کے ڈھیر پر علم کا کمزور محل تیار نہیں کیا، بلکہ وحی ربّانی پر مشتمل عالم گیر ہدایت انسانی کے صحیفہ کوانسان کی عملی اور تطبیقی زندگی سے مربوط کر کے علم کی ایسی شمع روشن کی جس سے مشرق ومغرب جگمگا اٹھے، اسلام کے نصاب درس کی خصوصیت ہی یہ تھی کہ اس کا نقطۂ نظر ہمہ جہتی تھا، یکطرفہ نہ تھا کیونکہ اسلام خدا کا پیغام اور فطرت انسانی سے ہم آہنگ ایک آفاقی مذہب ہے، اسلام کا نظریہ علم بلکہ ہر اصول نہ تو دیو مالا کا واہمہ ہے، اور نہ اصولِ منطق کا کوئی پیچیدہ مسئلہ، اللہ کو اسلام نے ایسے خالق کی حیثیت سے متعارف کرایا جس کا فرمان قلب وقالب میں یکساں جاری وساری ہے، اس لحاظ سے اسلام کے نصابِ تعلیم میں نہ کوئی رخنہ تھا اور نہ کوئی تناقص، اگر تاریخ کا کوئی طالب علم ایک نظر ان تاریک ادوار (DARK AGES) پر ڈالے جو اسلامی دور سے پہلے تھے، اور پھر جائزہ لے کہ اسلام کی آمد کے بعد کیا انقلاب رونما ہوا، اور خدا کے نازل کردہ آخری نظام ودستور حیات کے ذریعہ انسانی زندگی میں کیسے بہار آئی، تو برملا یہ اعتراف کریگا کہ واقعی اونٹوں کو چرانے والوں نے تہذیب کی شمعیں روشن کردیں، اندھیروں میں جینے والے نہ صرف روشنی میں آگئے بلکہ تاریکی کے دشمن بن گئے، انھیں جہالت کے ماحول میں گھٹن محسوس ہوتی تھی، صحابہ اکرامؓ جہاں گئے چلتے پھرتے مدرسے اور دوڑتے ہوئے علوم ومعارف کے چشمے بن گئے، جنھوں نے دنیا کو علم وتمدن اور تہذیب وآداب سے منور کردیا، معلم انسانیت نے ان کو سبق ہی ایسا پڑھایا تھا کہ وہ اس کے علاوہ کچھ جانتے ہی نہ تھے، ابونعیم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت نقل کی ہے: "كن عالما أو متعلما ولا تكن ثالثا" (کنز العمال، رقم الحدیث ۲۸۷۲) علم سکھاؤ یا سیکھو تیسرا کوئی کام نہ ہو۔

اسلام نے تعلیم وتعلم اور اشاعتِ علم پر جو فضائل اور اہلِ علم کا جو مقام ومرتبہ بیان کیا ہے، وہ محتاجِ تعارف نہیں ہے، اسلام نے علم کی اشاعت اور تعلیم وتعلم کی فضیلت بھی بیان کی ہے اور دوسری طرف علم کا موضوع اور اسکی غرض وغایت بھی متعیّن کی ہے، جس علم سے انسان خود فائدہ نہ حاصل کر سکے اور جو اسکی زندگی کے لئے مفید نہ ہو معلمِ انسانیت نے خود ایسے علم سے پناہ مانگی ہے، آپ ﷺ اپنی دعاء میں فرماتے تھے: "اللهم إني أعوذ بك من علم لا ينفع" اے اللہ ایسے علم سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو نفع نہ دے، اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے علم کا مقصد کوتاہ بنالیتا ہے یا علم کی ناقدری کرتا ہے، یا دو کف جو اسکا ہدف ہوتا ہے تو اس کے لئے اس طرح تنبیہ فرمائی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص ایسے علم کو جس سے اللہ کی رضا مقصود ہوتی ہے صرف دنیا کے چند ٹکوں کے لئے حاصل کرتا ہے وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو نہیں پا سکتا، (أبوداؤد، کتاب العلم، ۲۶۶۴) اسلام دین ودنیا کے علم کی تفریق نہیں کرتا، بلکہ اسلام میں نافع وضار کی تقسیم ہے، جو علم انسان کے لئے انفرادی واجتماعی حیثیت سے مفید ہے، اس کی روحانیت واخلاق کے لئے آرائش کا سامان ہے، آخرت میں کامیابی وفلاح کا ضامن ہے، اسلام اس پر ابھارتا ہے، اس کے سیکھنے کا حکم دیتا ہے، بلکہ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی بندۂ خدا اس جذبۂ نافعیت اور احساس دروں کے ساتھ علم سیکھتا ہے، تو زمین وآسمان کی بے زبان مخلوق اس کے لئے دعا کرتی ہے۔

قرنِ اول میں یہی علم کی روح اور اسپرٹ تھی جس نے عرب کے جاہلوں کو ذوقِ علم اور شوقِ جستجو کا ہمراز کیا انھوں نے علم وتہذیب کی ایسی شمعیں روشن کیں جس کی نورانی روشنی میں انسانی قافلوں نے سفر کیا، اور علم وتحقیق نے جلا پائی۔

نظامِ تعلیم کی اہمیت اور زندگی پر اس کا اثر: نظامِ تعلیم کسی بھی قوم کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو فرد کے لئے دماغ کی ہوتی ہے، اگر دماغ کسی سحرِ سامری کا شکار ہوجائے تو فرد کی ساری حرکات وسکنات اسی کے منشاء کے مطابق نمودار ہوتی ہیں، خواہ وہ اپنی جگہ یہ سمجھتا رہے کہ وہ فکر وعمل میں آزاد ہے، اسی طرح اگر کسی قوم کا نظامِ تعلیم متاثر ہوجائے، اور فساد واختلال کا شکار ہوجائے، تو اس قوم کی تمام معاشی، سیاسی، ثقافتی سرگرمیوں میں بگاڑ پیدا ہونا لازمی ہے، آج دنیا پر جو نظامِ تعلیم مسلط

ہے، جس سے دنیا متاثر ہے، جس کا جادو سر چڑھکر بول رہا ہے، وہ یورپ کا ایجاد کردہ اور اسکی دین ہے،

آج مغربی ممالک میں جاہل رہنا عیب ہے، اس کے معاشرہ میں ہر فرد کے لئے تعلیم لازم (Compulsory) ہے، یورپ جو کسی زمانہ میں جہالت کے اندھیرے میں بھٹک رہا تھا، اور مسلمان علم وتہذیب کے پیامبر تھے، آج معاملہ الٹ گیا ہے، ادھر ترقی واقبال اور عروج ہے، یہاں تنزل وادبار اور انحطاط روز افزوں ہے، تعلیم اور نظام تعلیم ہی قوموں کی زندگی کا معیار، ان کی کامیابی کی شاہ کلید، قافلۂ انسانیت کی صالح قیادت کا ضامن ہے،

آئندہ سطور میں عہد اول اور عہد نبوی کا نظام تعلیم، مدرسہ نبوت کی خصوصیات، انداز واسلوب کی ایک جھلک پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ گذرے ہوئے دنوں اور عہد رفتہ کا ایک بھولا ہوا سبق نہیں بلکہ مستقبل کی تعمیر کے لئے رہنما خطوط ہیں۔

یورپ اور اس پر اسلام کا اثر

مؤرخین یورپ کی تاریخ تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

۱- عہدِ قدیم، جبکہ یورپ رومن امپائر (ROMEN EMPIRE) کا محکوم تھا، اسکے پاس نہ علم کی روشنی تھی اور نہ تہذیب وتمدن کے خطوط، نہ معاشرت کا سلیقہ تھا، اور نہ معیشت کے اصول، غلامی کے بوجھ کا جوا ان کی گردن پر تھا، جہالت میں جیتے تھے اور جہالت میں مرتے تھے۔

۲- عہدِ وسطیٰ، یورپ کا یہ دوسرا عہد ہے جسمیں وہ چرچ کی حکمرانی اور کنیسہ کے رحم وکرم پر تھا، مسیحی خود نورِ علم اور حقیقی علم سے محروم ونا آشنا تھے، جو کچھ علم کا ورثہ تھا، وہ بھی دست برد سے محفوظ نہ تھا، اس عہد میں بھی یورپ جہالت وعلم دشمنی اور فکری جمود وتعطل کا شکار تھا۔

۳- تیسرا عہد یورپ کی بیداری (Awakening) کا ہے، جو تقریباً چودھویں صدی عیسوی کے اوائل سے شروع ہوتا ہے، اس وقت اسلامی علوم وتہذیب وتمدن اپنے عروج پر تھا، یورپ نے مسلمانوں کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، اور علوم وفنون ومعارف حاصل کئے، تہذیب وتمدن، اخلاق ونظام سیکھا، یورپ کی بیداری میں مسلمانوں کا بڑا حصہ ہے۔

کون سا ایسا علم ہے، جو یورپ نے مسلمانوں سے نہ سیکھا ہو حتی کہ صرف علوم ہی نہیں بلکہ نظام تعلیم، اندازِ تربیت سب مسلمانوں کا دیا ہوا ہے، جو کہ خالص اسلامی بنیادوں پر قائم ہے، بے شمار علوم وفنون، کیمیاء (Chemistry)، طب (Medical Science)، نجوم (Astronomy)، حساب (Mathmatic)، فنِ تعمیر وغیرہ سب مسلمانوں سے حاصل کئے ہیں، کسی نے کیا خوب اعتراف کیا ہے، ملاحظہ ہو:

It was from writings of Alkhawarizmi on Algebra, Astronomy, and arthmetics that Eourup received decimal notations, (The Muslims and New World Order, London P. 162)

یہ تو تاریخ کے ایسے نقوش ہیں، جن پر دلائل کی ضرورت نہیں، ایسے واضح حقائق ہیں جو محتاجِ بیان نہیں، کہ یورپ نے سب کچھ مسلمانوں سے سیکھا ہے، اور آج دنیا کا امام بنا ہوا ہے جس کی اصل پونجی تھی وہ اس سے غافل ہیں۔

عہد نبوی کا نظامِ تعلیم :

معلمِ انسانیت سید الاولین والآخرین محمد ﷺ کو خالق کائنات نے داعی، معلم اور ہادی بنا کر بھیجا تھا، آپؐ نے پوری انسانیت کو صحیح عقیدہ کی طرف دعوت دی، عدل ومساوات کی طرف بلایا، علم کے خشک سوتوں کو جاری کیا، آپ ﷺ نے جس نظام کے ذریعہ دنیا کی کایا پلٹ دی، انسانیت کے چمن کو گلزار بنا دیا، اس منہج میں چار چیزیں بنیادی طور پر داخل تھیں۔

۱- تلاوت کتاب، ۲- تزکیۂ نفوس، ۳- تعلیم الکتاب، ۴- تعلیم الحکمہ

قرآن مجید نے اس ترتیب کو اسطرح بیان کیا ہے "هو الذي بعث في الأميين رسو لا منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة ان كا نوامن قبل لفي ضلال مبين"

مکہ المکرّمہ پہلا اسلامی مدرسہ جو دارِارقم کے نام سے موسوم تھا

،معلمِ انسانیت اس مدرسہ اول کے منتظم اور معلم تھے ، جو کوئی خوش قسمت نورِ ہدایت کو پالیتا، وہ اسی مدرسۂ نبوت میں تعلیم حاصل کرتا تھا، اکابرین صحابہ، سابقین اولین، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ ،حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت بلالؓ جیسے مقدس ترین انسان اس مدرسہ کے تلامذہ تھے، اس مدرسۂ نبوت اور تعلیم وہدایت کی خبر پا کر لوگ دور دور سے علم حاصل کرنے آتے تھے، امام مسلمؒ نے حضرت ابو ذرغفاریؓ کا قصہ ذکر کیا ہے کہ کس طرح شوقِ علم میں اپنے شہر سے مکہ آئے، اوراس مدرسۂ نبوت سے فیضیاب ہوئے،

آج یورپ نے اور مغربی ممالک نے اپنے معاشرے میں تعلیم کو لازم قرار دیا ہے، یہ تصور صرف اسلام کی دین ہے، افسوس اپنے اس سے غافل ہیں اور پرائے غیر محسوس طور سے ہماری متاعِ گم گشتہ کے مالک بن گئے، یہ اصول انھوں نے اسلام کے نظامِ تعلیم سے سیکھا ہے کہ معاشرہ میں کوئی جاہل نہ رہے، ہادیِ انسانیت نے یہ اعلان کردیا، اپنی اولاد کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو، اور جب دس سال کے ہوجائیں تو نماز چھوڑنے پر سرزنش کرو۔ (ترمذی، ابوداود)

اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوتیں ہیں۔

۱- حضورؐ نے سات سال کی عمر میں بچوں کو نماز پڑھوانے کا حکم دیا ہے، یہاں بین السطور یہ بات بھی پنہاں ہے کہ بچہ کی اتنی تعلیم سات سال کی عمر سے قبل ہو جانی چاہئے کہ اس میں نماز سیکھنے کی اہلیت پیدا ہو جائے، یعنی بچہ کو مبادیات کا علم (Basic education) حاصل ہوجائے۔

۲- دوسرا حکم حضورﷺ نے یہ دیا ہے کہ دس سال میں نماز چھوڑنے پر بچوں کو سرزنش کرو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تک بچے کا شعور اس حد تک مکمل ہوجانا چاہئے کہ اس کے ذہن میں جزاء وسزا کا تصور پیدا ہو جائے، وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے لگے، وہ اپنے آپ کو ایک آزاد "معاشرتی حیوان" نہ سمجھے بلکہ اتنی تعلیم ہوجانی چاہئے کہ وہ فرائض سے کوتاہی نہ کرے۔

۳- شریعتِ اسلامی نے بالغ ہوجانے پر احکام کا مکلّف قرار دیا ہے، ارشادِ باری تعالی ہے ﴿وإذا بلغ الأطفال منكم الحلم فليستاذنوا كما استاذن الذين من قبلهم﴾ مذکورہ حکم کے ذریعہ اللہ تعالی نے بالغ ہونے کے بعد بچوں کو انھیں احکام کا مکلّف قرار دیا ہے، جن کے مکلّف بڑے لوگ ہیں، یعنی بلوغ کے بعد بچہ احکام کا مکلّف ہوجاتا ہے، وہ اب معاشرہ میں باقاعدہ ایک ذمہ دار فرد کی حیثیت رکھتا ہے، شریعت اسکو نکاح کا، خرید وفروخت کا، معاملات کا، عبادات کا مکلّف قرار دیتی ہے، اس کے کیے ہوئے تصرفات کو قانونی حیثیت سے نافذ مانتی ہے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو غزوۂ خندق کے موقع پر حضورﷺ نے جنگ کرنے اجازت دی تھی، اوراس وقت انکی عمر پندرہ برس تھی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ پندرہ سال کی عمر تک ایک شخص جن احکام کا مکلّف ہوجاتا ہے اسے کم از کم ان احکام کے مبادیات سے واقف ہونا از حد ضروری اور لازمی ہے ، گویا پندرہ سال کی عمر میں ہر شخص کو شریعت کے احکام کی عمومی معلومات حاصل کرلینا چاہئے، اس کے بغیر چارہ نہیں،

اس مرحلہ کے بعد اب انسان کو اختیار ہے کہ ذوق ومزاج کے اعتبار سے وہ کیا مشغولیت اختیار کرتا ہے، تعلیمی لائن میں کسی خصوصی فن کو سیکھنا چاہتا ہے، اوراس میں ترقی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، یا بس اسی پر اکتفا کرتا ہے، یعنی یہاں تک تو ضروری تعلیم سیکھنا تھا، اس کے آگے اختیار ہے، حضورﷺ کے ارشادِ گرامی کا یہی مطلب ہے، آپ ﷺ نے فرمایا "علم سیکھنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے" (ابن ماجہ ۱/ ۸۱ رقم الحدیث ۲۲۴)، مطلب یہ ہوا اس ضروری علم کے بغیر چارہ نہیں ہے، اتنا تو اسلامی معاشرہ کے ہرفرد پر علم حاصل کرنا فرض ہے ، اگر عبادت لازمی اور فرض وواجب ہے، تو اسکے متعلق علم کا حصول بھی فرض قرار دیا گیا، بلکہ حضرت عمرؓ نے تو سرکاری فرمان کے ذریعہ حصولِ علم کو لازمی قرار دیا تھا، انہوں نے حضرت سفیانؓ کی قیادت میں ایک جماعت کو متعین کیا تھا کہ عربی قبیلوں کا دورہ کریں، اور ہر مسلمان کا امتحان لیں جس کو قرآن مجید یاد نہ ہو، سزا دیں ،حضرت عمر نے ایک متعین نصاب تک مقرر کردیا تھا، جس کا پڑھنا ضروری تھا، عبدالرزاق نے مصنف میں نقل کیا ہے،

"حضرت عمرؓ نے فرمایا: ہر مسلمان کے لئے کم از کم چھ قرآنی سورتوں کا یاد کرنا ضروری ہے، دو فجر کے لئے، دو مغرب کے لئے اور دو عشاء کے لئے" (اخرجہ عبدالرزاق شرح حیاۃ الصحابۃ ۳/ ۲۷۳)

امام بیہقی اور حاکم نے مسور بن مخرمہ کی روایت نقل کی ہے:

حضرت مسور بن مخرمہؓ سے روایت ہے، انہوں حضرت عمرؓ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ سورہ بقرہ، سورہ نساء، سورہ مائدہ، سورہ حج، اور سورہ نور سیکھو، ان سورتوں میں فرائض کا بیان ہے۔ (رواہ البیھقي والحاکم۔ شرح حیاۃ الصحابۃ ۳/۶۷۳)

سعید بن منصور نے حضرت عمر کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے "**علموا نسائکم سورۃ النور** (رواہ سعید بن منصور فی سننہ الدر المنثور للسیوطي ۶/۲۴) اپنی عورتوں کو سورہ نور سکھاؤ، مدینہ منورہ کی درسگاہِ نبوت "صفہ" کے طریقۂ تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ مدرسۂ نبوت میں تعلیم کے دو طریقہ تھے۔

۱- ایک یہ کہ دس بیس دن یا مہینہ دو مہینہ رہ کر عقائد اور فقہ کے ضروری مسائل سیکھ لیتے تھے، اور اپنے قبائل میں واپس چلے جاتے تھے، اور ان کو تعلیم دیتے تھے، مثلاً مالک بن الحویرثؓ جب سفارت لے کر آئے تو بیس دن قیام کیا اور ضروری مسائل کی تعلیم حاصل کی، جب چلنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا "**ارجعوا الی أھلیکم فعلموھم، ومروھم، وصلو کما رأیتموني أصلي** (بخاري باب رحمۃ البھائم) اپنے خاندان میں واپس جاؤ، ان میں رہ کر ان کو اوامرِ شریعت کی تعلیم دو، اور جس طرح مجھکو نماز پڑھتے دیکھا ہے اسی طرح نماز پڑھو۔

۲- دوسرا مستقل طریقہ درس کا تھا، یعنی لوگ مستقل طریقہ سے مدینہ میں رہتے تھے، اور عقائدِ شریعت اور اخلاق کی تعلیم پاتے تھے، ان کے لئے صفہ خاص درسگاہ تھی، اور اس میں زیادہ تر وہ لوگ قیام کرتے تھے، جو تمام دنیوی تعلقات سے آزاد ہوکر شب و روز زہد و عبادت اور زیادہ تر خدمتِ علم میں مصروف رہتے تھے۔ (سیرۃ النبی ۲/۸۹، دار المصنفین اعظم گڑھ)

اس سے معلوم ہوا کہ قرونِ اول میں تعلیم کے دو منہج تھے، ایک ضروری تعلیم (COMPLSARY CORSE) اور دوسرا اختصاص (SPACIALIZATION)، پہلے حصہ کا سیکھنا ہر شخص کے لئے ضروری تھا، اس کا اشارہ قرآن مجید کی اس آیت میں بالکل صاف اور واضح ہے۔

﴿**شھد اللہ أنہ لا إلٰہ إلا ھو والملائکۃ وأولو العلم قائما بالقسط**﴾ ﴿اللہ شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں، فرشتے بھی اس کے گواہ ہیں اور اہلِ علم بھی﴾ ظاہر کہ توحید سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے، اور توحیدِ الٰہی پر اہلِ علم کی شہادت کا مطلب یہ ہوا کہ ایک متعین حد تک علم سیکھنا سب کیلئے ضروری ہے، فرائض اور حلال و حرام کا جاننا ہر شخص کے لئے ضروری ہے، بغیر اس کے انسان دین پر عمل نہیں کرسکتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے کوکلمہ گو مستثنیٰ نہیں ہوسکتا۔

دوسرا کورس خاص لوگوں کے لئے تھا، اس کا اشارہ بھی قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿**فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم إذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون**﴾

یعنی اصولی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ ایک مختصر مدتی نصاب تھا، جو فرضِ عین (Strict obligation) تھا، اور دوسرا طویل مدتی نصاب جو کہ فرضِ کفایہ (GENERAL OBLIGATION) تھا، اگر مذکورہ احادیث اور عہدِ اول کی روشنی میں نصابِ فرضِ عین کا مطالعہ کیا جائے تو درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱- کم از کم اتنا علم جس کے ذریعہ سے اس کی نمازیں و عبادات درست ہوں سیکھنا ضروری تھا۔

۲- اخلاق، معاشرت، معیشت، تجارت، حلال و حرام، وغیرہ احکامات کے متعلق عمومی معلومات ضروری تھیں، حضرت عمرؓ نے اسی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا تھا، ﴿**لا یبع فی سوقنا من لم یتفقہ**﴾ جو شخص معیشت کے بنیادی احکام نہ جانتا ہو وہ ہمارے بازار میں دوکان کھولنے کا حق نہیں رکھتا،

۳- انسان پر جو فرائض و ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کی معلومات کا حاصل کرنا ضروری تھا۔

۴- عورتوں کے لئے اس کے ساتھ ساتھ انکی گھریلو زندگی اور خانگی امور سے متعلق بنیادی معلومات کا حصول ضروری تھا،

افسوس کہ آج یہ خالص اسلامی تصور یورپ نے اختیار کرلیا ہے اور مسلمان اس سے غافل ہیں، آج وہاں کے معاشرہ میں جہالت عیب

ہے، آج اگر یہ سوال مسلمان اہل دانش وارباب مدارس سے کیا جائے کہ انہوں نے نظام نبوی کے ایک پہلو فرضِ کفایہ کو تو لے لیا، لیکن مسلمانوں کی عمومی تعلیم جو کہ فرضِ عین ہے، اس کے لئے کیا نظام اور کیا نصاب متعین کیا ہے، آخر اس پہلو کو تشنۂ عمل کیوں چھوڑا گیا ہے۔

بچپن میں تحصیل علم

اگر چہ مدرسہ نبوت میں چھوٹے بڑے بوڑھے جوان سب لوگ پڑھتے تھے علم حاصل کرنے میں کسی خاص عمر کی قید نہیں تھی جسطرح بلا تکلف بچے پڑھتے تھے اسطرح بڑے لوگ بھی بے حجاب و بے تکلف علم سیکھتے تھے، لیکن احادیث میں بچپن میں تعلیم حاصل کرنیکا اشارہ ملتا ہے، طبرانی نے ابودرداء کی حدیث نقل کی ہے۔

احنف بن قیس نے حضرت عمرؓ کا ارشاد نقل کیا ہے ﴿تفقهوا قبل أن تسودوا (بخاری کتاب العلم رقم الحدیث ۱۵، مسند دارمی ۱/۹۷)﴾ سرداری حاصل کرنے سے پہلے علم سیکھ لو۔

ان آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بچپن میں تعلیم کی اہمیت پر توجہ دی ہے، بلکہ عملاً اس کا ایک زبردست محکم نظام بھی دیا ہے، اگر چہ مدرسۂ نبوت میں بڑی عمر کے لوگ بھی علم حاصل کرتے تھے، جیسا کہ خود اس حدیث میں امام بخاری نے یہ جملہ بھی تعلیقا اپنی الجامع الصحیح میں نقل کیا ہے ﴿وقد تعلم أصحاب النبی ﷺ في کبر سنهم﴾ اصحاب نبی ﷺ بڑی عمر میں بھی علم سیکھتے تھے۔

پہلا اسلامی اسکول

عہد اول کا سب سے قدیم مدرسہ (SCHOOL) ''دار ارقم'' مکہ مکرمہ میں تھا، جہاں مسلمان چھپ چھپ کر جمع ہوتے تھے، اور تحصیل علم وعبادت الہی میں مشغول ہوتے تھے، سابقین اولین صحابہ اس مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہیں، جنہوں نے تاریخ انسانی میں علم وتمدن کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، حقیقۃً یہ مدرسہ ایک انقلابی مرکز تھا جہاں کمزور وبے سہارا اہل ایمان فیض نبوی سے استفادہ کرتے، اور دنیا کی پھیلی ہوئی گمراہی سے دور، ضلالت وجہالت، ظلم وبے راہ روی کے اندھیروں میں نور نبوت سے اپنے قلب ودماغ کو منور کر رہے تھے، یہ اسلامی سرگرمیوں کا مرکز تھا، یہ وہ پاور ہاؤس تھا جہاں سے انسانی زندگی کو طاقت فراہم کی جاتی تھی، مستدرک حاکم میں ہے ''آنحضرت ﷺ ابتدائے اسلام میں اسی مرکز میں رہتے، لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے'' (مستدرک حاکم ۳/۵۰۲) مسلمانوں کے مکہ سے ہجرت کرنے تک یہ مدرسہ (SCHOOL) سازشوں کے سخت ترین نرغے میں چلتا رہا، اور تعلیم وتربیت کا فریضہ انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں انجام دیتا رہا، در اصل مکہ مکرمہ میں دار ارقم کا قیام ایک انقلابی قدم تھا، جس میں تعلیم وتربیت کا نظم تھا، دعوتی منصوبہ بندی وحکمت عملی تیار کی جاتی تھی، باہم مشورے ہوتے تھے، تسبیح ومناجات اور دعاؤں کا اہتمام ہوتا تھا، قرآن وسنت کی تعلیم ہوتی تھی، صحابہ ایک دوسرے سے ملاقات کرتے، گویا یہ مدرسۂ نبوت اسلامی تاریخ کا مکی دور میں ایک اہم سنگ میل تھا، ابوالولید ازرقی کہتے ہیں:

''حضور ﷺ اور صحابہ دار ارقم میں جمع ہوتے تھے، آپ ﷺ انہیں قرآن پڑھاتے، اور تعلیم دیتے تھے'' یہیں پر مسلمانوں کے مسائل اور مشکلات کے بارے میں مشورے ہوتے تھے، حل تلاش کیے جاتے تھے، ابن ہشام نے ذکر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو مکہ کے سنگین مسائل کے پیش نظر خطاب کرتے ہوئے دار ارقم میں فرمایا تھا: ''تم سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کرو، وہاں ایک انصاف پرور کی حکومت ہے، اس کے پاس کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا، وہ سچائی کی سرزمین ہے، یہاں تک کہ اللہ تمہارے لئے کشادگی پیدا فرمادے'' دار ارقم مدرسہ اولی بھی تھا، اور مسلمانوں کی ایک پناہ گاہ، عبادت گاہ، اور دار الشوری بھی تھا، اسلام کی سربلندی کے منصوبے اور دعاؤں کا اہتمام یہیں ہوتا تھا، حضرت خباب بن الارت نے حضرت عمر بن الخطاب کے قبول اسلام کے بعد انہیں خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں حضور اقدس ﷺ کو دار ارقم میں یہ دعا کرتے ہوئے سنا تھا: "اے اللہ اسلام کو اُبوالحکم بن ہشام یا عمر بن خطاب کے ذریعہ تقویت وتائید عطا فرما''

غور کا مقام ہے کہ معلم انسانیت کا طریقۂ تعلیم صرف دار ارقم کے مدرسہ میں بیٹھ کر ہی پڑھانا اور وعظ وتذکیر نہ تھا بلکہ داعی حق کے قلب مبارک میں ایک تڑپ اور خلش تھی، اور پہلو دل میں جہالت کو دیکھ کر ایک کانٹا سا چبھتا تھا، معلم انسانیت حضور ﷺ بازاروں

میں، گلیوں میں، میلوں میں، تنہائیوں میں، غرض ہر جگہ تعلیم و وعظ وتذکیر کا فریضہ انجام دیتے تھے، تاکہ لوگوں میں علم کا شوق اور ہدایتِ ربانی کا ذوق پیدا ہو، ہم عہد نبوی کے طریق تدریس وتعلیم پر آئندہ سطور میں مختصراروشنی ڈالیں گے، مدرسہ دارِ ارقم کے علاوہ ہجرت نبوی سے قبل ایک اور زندہ دل دینی درسگاہ کا ذکر ملتا ہے، وہ حضرت فاطمہ بنت خطابؓ زوجہ حضرت سعید بن عمرو بن نفیل کا مکان تھا، جس کے معلم حضرت خباب بن الارت تھے،

دوسرا اسلامی اسکول

جب آں حضرتﷺ نے مکہ سے مدینہ کیطرف ہجرت فرمائی تو مدینہ منورہ میں دوسرا اسلامی مدرسہ (ISLAMIC SCHOOL) قائم کیا گیا جو تاریخ میں صفۂ نبوی کے نام سے مشہور ہے، اس مدرسہ کے تلامذہ وفارغین یکتائے روزگار اور نوابغ زمانہ ثابت ہوئے، اس مدرسہ میں تعلیم وتربیت کی نگرانی خود معلم انسانیت نبی آخرالزماں ﷺ فرماتے تھے، عہدِ رسالت کا مطالعہ کرنے والا شخص جانتا ہے کہ بڑے بڑے نوابغ اور یکتائے روزگار افراد اس مدرسہ سے فارغ ہوئے، جو مسجد کے خطیب، منبر کے داعی ،میدانِ جنگ کے کمانڈر، ملکوں کے فاتح، اور علوم کے منارۂ نور تھے ،ان میں عبداللہ ابن عباسؓ، عبداللہ ابن عمرؓ، معاذ ابن جبلؓ، ابوموسی اشعریؓ جیسے دقیق النظر ماہرینِ قانون، حضرت عمرؓ وحضرت علیؓ جیسے سیاسی منتظم ومدبر ،حضرت سعدؓ وابو عبیدہؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ جیسے باکمال جنرل اور ماہرینِ جنگ، حسان ابن ثابتؓ، کعب ابن زہیرؓ، عبداللہ ابن رواحہؓ جیسے بلند پایہ ادیب وشاعر، نعیم ابن مسعودؓ جیسے سی، آئی ،ڈی انسپکٹر، حضرت عثمان غنیؓ، عبدالرحمٰن بن عوف جیسے نامور تاجر موجود تھے، اور بھی کتنے تاریخ ساز اور باکمال افراد تھے، یہ سب مدرسۂ نبوت کے تعلیم یافتہ تھے ۔

کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا

دراصل یہ اس تعلیم کا اثر تھا جس کی بنیاد وحی الٰہی پر تھی ،جسکے مدرس خود معلمِ انسانیت تھے، جس کی درسگاہ صفۂ نبوی تھی،

عہد نبوی کا طریقۂ تدریس

جو لوگ علم کی تلاش وتحقیق میں نکلتے اور علم سے آراستہ ہونا چاہتے ہیں، ان کو چاہئے کہ سب سے پہلے معلمِ انسانیت کی درسگاہِ نبوت کا طرزِ تدریس، انتظام وانصرام کا مطالعہ کریں، آج یونیورسٹیوں کالجز اور غیر اسلامی اسکول کا تو کیا کہنا، خود بے شمار مسلمان یہ بھی نہیں جانتے کہ صفۂ نبوی و مدرسۂ نبوت کا طرز و اسلوب کیسا تھا ، اسکا نصاب کیا تھا، کلاس کی حاضری کے اوقات وآداب کیا تھے، ہم ذیل کے سطور میں اسکا ایک مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں۔

طلبائے صفہ کا شوقِ علم

گذشتہ سطور میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ علم کا سیکھنا تعلیم کا حصول ایک حد تک ہر شخص کے لئے ضروری تھا، اس سے کوئی آزاد نہیں تھا، کچھ لوگ صرف فرض عین (Strict obligation) پر اکتفا کرتے تھے اور کچھ لوگ اس سے آگے بڑھکر اختصاص (SPACIALIZATION) اور فرضِ کفایہ (GENRAL OBLIGATION) تک تعلیم حاصل کرتے ،ظاہر ہے کہ زندگی کے دوسرے معمولات جس طرح ہمارے ساتھ ہیں اسی طرح ان کے ساتھ بھی تھے، لیکن یہ معمولات ان کی تعلیم میں مخل نہیں ہوتے تھے، انہوں نے اپنا نظام العمل اس طرح مرتب کیا تھا کہ تعلیم بھی مکمل ہوجائے اور معمولات زندگی میں بھی خلل نہ ہو ،امام بخاریؒ نے حضرت عمر کی مندرجہ ذیل حدیث نقل کی ہے:

''حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں اور بنی امیہ بن زید کا میرا ایک انصاری پڑوسی تھا، جو کہ عوالی مدینہ کا رہنے والا تھا، حضور ﷺ کی خدمت میں باری باری ہم لوگ اس طرح حاضر ہوتے کہ ایک دن وہ آتے ،اور ایک دن میں آتا تھا، جب میں آتا تھا اس دن کا سبق اپنے ساتھی کو بتا دیتا تھا اور جب انکی باری ہوتی وہ آتے تو مجھے بتا دیتے'' (بخاری کتاب العلم رقم الحدیث ۸۹)

ایسا نظام کہ تعلیم بھی ضروری ہو ، ہر شخص علم سیکھتا ہو، اور ضروریاتِ زندگی بھی درہم برہم نہ ہوں یہ صرف مدرسۂ نبوت کی خصوصیت ہے، علم اور زندگی کے مابین یہ توازن تھا، کہ تعلیمی امور بھی جاری اور مشاغل زندگی میں بھی کوئی خلل نہیں،

مدرسہ سے چھٹی کے بعد گھر والوں کو تعلیم دینا

تعلیم دینا : مدرسۂ نبوت کا حال یہ تھا کہ جب طلباء کی چھٹی ہوتی

تھی ،اور وہ اپنے گھر جاتے تھے تو معلمِ انسانیت کا فرمان تھا کہ گھر جا کر وقت ضائع نہ کیا جائے ، بلکہ وہاں تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری رہے،امام بخاریؒ نے ''الأدب المفرد'' میں نقل کیا ہے۔

''حضرت مالک بن حویرثؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ہم لوگ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ، اور ہم سب ہم عمر نوجوان تھے ،ہم نے آپ کے پاس بیس دن قیام کیا ،آپ ﷺ کو خیال ہوا کہ شاید ہمیں اہل وعیال کی یاد آ رہی ہے ،تو آپ ﷺ نے ہم سے دریافت فرمایا،تو ہم نے آپ ﷺ کو بتادیا، آپ نہایت مہربان اور رحیم تھے ،فرمایا اپنے اہل وعیال کے پاس جاؤ ،ان کو بھی علم سکھاؤ ،اور اعمال صالحہ کا حکم دو،اور ایسے نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا''(بخاری فی الأدب المفرد نقلاعن دورالمنھاج الربانی ص۱۴۰)

غور کرنے کا مقام ہے کہ حضور ﷺ نے نوجوانوں کے انسانی تقاضوں کوملحوظ رکھتے ہوئے گھر جانے کا حکم دیا،اور ساتھ ہی ہدایت بھی فرمادی کہ گھر والوں کو، بیوی بچوں کو بھی اس خیر میں شریک کریں، جو مدرسہ نبوت میں سیکھا ہے،

امام بخاریؒ نے کتاب العلم میں ایک باب قائم فرمایا ہے: باب تعليم الرجل أمته و أهله ،اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ اپنی باندی واہل خانہ کو تعلیم دے ،علم سکھائے ، اسی طرح امام بخاریؒ نے کتاب العلم میں وفد عبدالقیس کا واقعہ ذکر کیا ہے اور اس پر جو عنوان قائم کیا ہے وہ یہ ہے: باب تحريض النبی ﷺ وفد عبد القيس على أن يحفظوا الايمان و العلم ،وأن يخبروا به من ورائهم، یعنی حضور ﷺ نے وفد عبدالقیس کو اس پر ابھارا کہ علم اور ایمان کو اچھی طرح یاد کریں، محفوظ کریں ،اور اس کی دوسروں کو تعلیم دیں۔

تعلیم نسواں کا نظام

عہدِ اول میں معلم انسانیت نے تعلیم نسواں کا بھی باقاعدہ نظام قائم فرمایا تھا، کتنی صحابیات ہیں جو علوم تفسیر ،حدیث وفقہ میں نمایاں مقام رکھتی ہیں ،حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت ام سلمہؓ حضرت اسماءؓ بنت ابوبکرؓ ،اور بے شمار صحابیات ہیں ،جنھوں نے مدرسۂ نبوت سے تعلیم حاصل کی ،ان کے علمی نقوش تاریخ کے اوراق میں ثبت ہیں ، ہم اس مختصر مضمون میں اس کو ذکر کرنے سے قاصر ہیں ،صرف عہدِ اول کے تعلیمی نظام کی ایک جھلک پیش کرنا مقصود ہے ،امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے نقل کیا ہے۔

''حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواتین نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے مقابلہ میں مرد زیادہ استفادہ کرتے ہیں ،لہٰذا ہماری تعلیم کے لئے کوئی دن مقرر فرما دیجئے ،آپ ﷺ نے ان سے ایک دن کا وعدہ فرما لیا، جس میں آپ ﷺ ان سے ملاقات کرتے ،انہیں نصیحت کرتے ،تعلیم دیتے'' (بخاری کتاب العلم رقم الحدیث ۱۰۱)

یہ ایک روایت عہدِ اول میں تعلیمِ نسواں کے طریقہ کار ،اہمیت وضرورت ،منہج کو بتانے کیلئے کافی ہے ،گذشتہ سطور میں حضرت عمرؓ کی وہ روایت گذر چکی ہے جسمیں آپ ﷺ نے عورتوں کو سورہ نور کی باقاعدہ تعلیم دینے کیلئے کہا ہے،

عہد نبوی میں کلاس کا وقت

عام طور پر موجودہ دور میں کالجز اور اسکولز میں کلاس کا وقت دیر سے شروع ہوتا ہے، اسلامی نظامِ تعلیم میں مدرسۂ نبوت کا وقت صبح سویرے ہی شروع ہوجاتا تھا ،صبح کا جانفزا وقت تعلیم کے لئے نہایت ہی اہمیت کا حامل اور موزوں ہے ،حضرت عائشہ کی حدیث ہے:

''حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا تعلیم کے لئے صبح کا وقت اختیار کرو اس لئے کہ میں نے صبح کے وقت میں برکت کیلئے اپنے رب سے دعا کی ہے۔''

نو دس بجے تک سو کر کلاس میں جانے والے طلباء ابتدائے دن میں تعلیم کے پر کیف منظر اور پھر اسکی برکت نیز دل دماغ پر اسکے اثرات کا تصور بھی نہیں کر سکتے ،اہلِ دانش کو اس کا بھی ناقدانہ جائزہ لینا چاہئے کہ دس بجے تک بوجھل ہونے والے ،تھکے ماندے دماغ ،دیر تک سونے والے مضحمل قوی میں علم حاصل کرنے کی کتنی صلاحیت باقی رہتی ہے۔

کلاس میں بیٹھنے کے آداب

مدرسۂ نبوت کے طلباء جب مجلسِ علم (CLASS

ROOM)میں ہوتے تھے،تو تحصیل علم کے آداب کے ساتھ مجلس علم کے آداب کا خیال رکھتے تھے،معلمِ انسانیت نے مجلس میں بیٹھنے تک کی ہدایت ارشاد فرمائی تھیں،ابونعیم اور دیلمی نے صفہ نبوی کے ممتاز ترین طالب علم حضرت ابوہریرہؓ کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

''حضورﷺ نے ارشاد فرمایا:جب تم مجلس علم(class room)میں حاضر ہوتو قریب قریب ہوکر بیٹھو،ایک کے پیچھے ایک ترتیب سے بیٹھیں،اورتم لوگ زمانہ جاہلیت کی طرح کی متفرق الگ الگ نہ بیٹھو۔''(ابونعیم ودیلمی عن ابی هريرة كنز العمال:۱۰/۲۳۹(۲۹۲۶۹)

مسند بزار کی روایت ہے!

''حضرت قرۃ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسولﷺ جب درس دینے کیلئے بیٹھتے تھے،تو صحابہ آپﷺ کے اردگرد حلقہ بنا کر بیٹھتے تھے''(رواہ البزار۔شرح حیاۃ الصحابۃ۳/۶۳۵)

یہ معلم انسانیت کے کلاس اور درس گاہ کا نقشہ تھا،جس سے علم و تمدن کے وہ تابندہ نقوش فارغ ہوکر نکلے جو علم کے پیغامبر تھے،معلم انسانیت کھڑے ہوکر بھی پڑھاتے تھے اور بیٹھ کر بھی، ابونعیمؒ نے مدرسہ نبوت کے مشہور طالب علم حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے

''حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک دن حضرت ابوطلحہؓ آئے تو دیکھا کہ حضورﷺ کھڑے ہوئے صفہ کے طلباء کو پڑھا رہے ہیں،آپکے پیٹ پر ایک پتھر بندھا ہوا ہے جس سے بھوک کی حالت میں کمر سیدھی ہے''(أبو نعیم فی الحلیۃ ۱/۳۴۲=شرح حیاۃ الصحابۃ۳/۶۶۹)

اسکے علاوہ حضورﷺ کرسی پر بیٹھ کر بھی تعلیم دیتے تھے،اور آپﷺ سے کرسی پر پڑھانا ثابت ہے، امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں ابورفاعہ سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

''حضرت ابورفاعہ فرماتے ہیں کہ میں اللہ کے نبی کی خدمت میں حاضر ہوا،آپﷺ خطاب فرما رہے تھے، میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسولﷺ میں ایک پردیسی آدمی ہوں،جو دین کے بارے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں،وہ کہتے ہیں کہ حضورﷺ میری طرف متوجہ ہوئے اور اپنے خطاب کو نامکمل چھوڑ دیا،حتی کہ میرے پاس تشریف لے آئے،تو آپ کے پاس ایک کرسی لائی گئی، مجھے خیال ہے کہ شاید اسکے پائے لوہے کے تھے،آپ اس پر بیٹھ گئے اور مجھے دین کی معلومات سکھانے لگے، اسکے بعد آپ نے اپنے خطبہ کو مکمل کیا''

اس حدیث سے حضور کے طریقہ تدریس،تعلیم کی اہمیت،طلباء کیساتھ استاد کا انداز محبت وشفقت اور ایک اجنبی مسافر کی تعلیم کیلئے دوسرے کاموں کو اگرچہ وہ بھی اسی سے متعلق ہو مؤخر کرنا،آپکا شوق علم وغیرہ ان تمام امور کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

استاد کیلئے ھدایت

کسی بھی نظام تعلیم کے ڈھانچہ میں سب سے اہم کردار استاد کا ہے،طالب علم اسی کی فکر اور اسی کی روح اختیار کرتا ہے،طلباء کی ذہنیت انکی نشو ونما وتربیت پر استاد کی فکر اور طرز اسلوب کا گہرا اثر ہوتا ہے، نبی اکرم معلم انسانیتﷺ نے اس باب میں اپنے حسین ترین اسوہ کے علاوہ مستقل ہدایات دی ہیں،دیلمی نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت نقل کی ہے: ''اللہ کے رسولﷺ نے فرمایا!اپنے طلباء کے ساتھ نرم مزاجی ونرمی اختیار کرو،اورتم سخت مزاج وتندخو مت بنو،مبادا کہ تمہاری جہالت تمہارے علم پر غالب آجائے''

اسی طرح ابن عبدالبر نے حضرت عمرؓ بن خطاب کا قول نقل کیا ہے:

''حضرت عمرؓ نے فرمایا! کہ علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ نیز علم کا وقار وادب بھی سکھاؤ،اپنے طلباء واساتذہ کیساتھ تواضع،نرمی خوش اخلاقی سے پیش آؤ،سخت مزاج تندخو علماء میں سے مت بنو،اسلئے کہ تمہارا علم تمہاری جہالت کیساتھ قائم نہں رہ سکتا۔''(جامع بیان العلم ،شرح حیاۃ الصحابۃ۳/۶۶۸)

طبرانی اور امام احمدؒ نے حضرت ابودرداء کی مندرجہ ذیل حدیث بھی نقل کی ہے: (رواہ الطبری۔شرح حیاۃ الصحابۃ۳/۶۳۴۳)

''حضرت ام درداء سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ ابودرداء جب بھی کوئی حدیث بیان کرتے تو مسکراتے تھے،میں نے ان سے عرض کیا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کے اس عمل کو لوگ حماقت نہ سمجھیں،تو انہوں نے فرمایا: اللہ کے رسولﷺ جب بھی کوئی حدیث بیان فرماتے تو آپﷺ مسکراتے تھے۔'' (رواہ الطبری۔شرح حیاۃ الصحابۃ۳/۶۳۴۳)

ان روایات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ استاد کو اسلام نے طلباء کیساتھ خوش کلامی، نرم مزاجی، نرم گفتاری، وملاطفت کی ہدایت کی ہے، تاکہ طالب علم بے خوف وبلا جھجک استاد سے استفادہ کر سکے اگر استاد کی بد خلقی سختی وتند خوئی طلباء کیلئے حجاب بنتی ہے، تو حدیث کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی جہالت ہے۔

استاد کے تعلق سے طلباء کو ہدایت

”استاد کے حقوق یہ ہیں کہ اس سے بہت زیادہ سوالات مت کرو، اس کو جواب دیتے ہوئے سخت کلامی مت کرو، اگر وہ اعراض کرے تو ضد مت کرو، اگر وہ سستی کرتا ہے تو تم اسکے کپڑے مت پکڑو، اپنے ہاتھ سے اسکی طرف اشارہ مت کرو، اسکی طرف آنکھیں مت چلاؤ، اسکی مجلس میں سوال مت کرو، اس کی لغزشوں کو مت ڈھونڈو، اگر اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو اس کے رجوع کا انتظار کرو، اور اس کے رجوع کو قبول کرو، اس کے سامنے یہ نہ کہو کہ فلاں کا قول آپ کے خلاف ہے، اس کا راز فاش مت کرو، اور اس کے پاس کسی کی غیبت نہ کرو، اس کی موجودگی وغیر موجودگی میں حفاظت کرو، دوسرے لوگوں کو عمومی سلام کرو اور استاد سے خصوصی سلام و ملاقات ادب کیساتھ کرو، اس کے سامنے ادب سے بیٹھو، اگر اس کو کوئی ضرورت ہو تو اوروں سے پہلے اسکی خدمت کی طرف لپکو، اس کی ہم نشینی سے نہ اکتاؤ، استاد پھل دار درخت کے مانند ہے انتظار کرو کہ کب اس سے تمہارے دامن میں کوئی پھل گرتا ہے“ (ابن عبدالبر، فی جامع بیان العلم، شرح حیاۃ الصحابہ ۳/۶۴۸)

یہ پاکیزہ نصائح اور استاد کے ادب کا بہترین تصور، بے مثال ذریں احکام آج ہمارے لئے سنگ میل ہے۔

تعطیل اور انٹرول کا نظام

نظام تعلیم میں اگر طلباء کی نفسیات اور مستقل بوجھ کی وجہ سے انکے اکتانے اور ملول خاطر ہونے کا خیال رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے طلباء کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا ہے، صحابہ کرام کے تعلیمی نظام میں اس کا بھی خیال رکھا جاتا تھا، نظام تعلیم میں ضیاع وقت، بے مقصدیت، تعلیم کم اور چھٹی زیادہ نہیں ہوتی تھی، ایک تعلیم وتعلم کا تسلسل تھا، جو ہمہ وقت جاری رہتا تھا، ہاں طلبہ کی نفسیات کے پیش نظر بوقت ضرورت ان کو متفرق اوقات میں حسب ضرورت و مصلحت چھٹی بھی دی جاتی تھی، امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی حدیث نقل کی ہے۔

عن عبدالله بن مسعودؓ قال: كان رسول الله ﷺ يتخولنا بالموعظة كراهة السآمة علينا (بخاری كتاب العلم رقم الحديث ٦٩)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ ہم کو ہمارے ملول خاطر ہونے کے اندیشہ سے وقفہ وقفہ سے نصیحت کیا کرتے تھے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے یہ بھی اشارہ کردیا کہ چھٹی کس اصول کے تحت ہوتی تھی۔

”حدیث مذکور اچھے کاموں میں ترک تسلسل وعدم مواظبت کا اشارہ ملتا ہے، تاکہ طبیعت گھبرا نہ جائے، اس کا ضابطہ یہ ہے کہ نشاط کی رعایت کرتے ہوئے حسب ضرورت چھٹی ہوئی تھی۔“ (فتح الباری ۱/حدیث ۶۹)

گذشتہ سطور میں حضرت مالک بن حویرث کی گذر چکی ہے جس میں یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو گھر جانے کی چھٹی دی تھی، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ گھر جاکر بھی وقت ضائع نہیں کرنا ہے، بلکہ وقت کو کام میں لاکر وہاں بھی تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری رکھنا ہے۔

مدرسہ نبوت کے تعلیم یافتہ امیر المومنین حضرت عمرؓ تو باقاعدہ انٹرول بھی کرتے تھے تاکہ کچھ دیر آرام کرکے طلباء میں نشاط پیدا ہو جائے، ابن السمعانیؒ نے نقل کیا ہے: كان عمرؓ يحدث الناس فاذا رآهم قد تنابوا وملوا، أخذ بهم في غراس الشجر (ابن السمعاني شرح حياةالصحابة ٣ ٦٥٢)

حضرت عمرؓ لوگوں کو پڑھاتے تھے، اور جب دیکھتے کہ طلباء پر اضمحلال اور سستی چھا رہی ہے، تو انکے ساتھ باغبانی کے کام میں لگ جاتے، اور ایسا اس لئے کرتے تھے کہ طلباء کے اندر از سر نو نشاط پیدا ہو جائے، اور طبیعت ملول کی پژمردگی ختم ہو جائے۔

حسب ضرورت تبدیلی نصاب

صحابہ کرام کا علمی ذوق ومزاج ایسا تھا کہ ہمہ وقت تعلیم وتعلم میں ہی مشغول رہتے تھے، وہ علم تو سیکھتے تھے، لیکن بے مقصد علم اور

محض فلسفہ نہیں بلکہ ان کا علم عملی زندگی سے عبارت تھا، نظریات محض نظریات نہیں تھے بلکہ تطبیقی شکل میں تھے، چنانچہ علم نبوت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ جب ان کو ضرورت محسوس ہوئی دوسری زبانوں اور دوسرے علوم کو حاصل کیا جائے تو بقدر ضرورت اس کو بھی حاصل کیا، مندرجہ ذیل احادیث سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلامی نظام تعلیم میں اصل اور ضروری علم کون سے ہیں، اور نصاب میں دوسرے علوم کو کس حد تک اور کتنا سیکھا جا سکتا ہے، دال میں جتنے نمک جتنے مرچ کی ضرورت ہو اس کو بھی استعمال کیا جاتا ہے لیکن اتنا نہیں کہ دال غائب ہو جائے اور نمک ہی نمک یا مرچ ہی مرچ رہ جائے، موجودہ نظام کے ناقدانہ جائزہ لینے کیلئے اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہئے کہ کون سے علوم کس حد تک ضروری ہیں، امام احمد ابن حنبلؒ نے حضرت زید کی مشہور حدیث نقل کی ہے:

''حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ حضورﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیا تم سریانی جانتے ہو، میرے پاس کچھ مکتوب سریانی زبان میں آتے ہیں، انھوں نے عرض کیا کہ نہیں جانتا ہوں، حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ پس میں نے سریانی زبان کو سترہ دنوں کے اندر سیکھ لیا۔''(مسند احمد ۵/۱۸۲)

اسی طرح کی روایت کو ابن عساکر اور ابو یعلیٰ نے نقل کیا ہے جسکے الفاظ یہ ہیں،

فقال رسول اللهﷺ تعلم لی كتاب يهود، فانی والله ماآمن يهود على كتابى فتعلمته، فكنت اكتب لرسول اللهﷺاذا كتب اليهم، وأقرء كتابهم اذا كتبوا اليه۔(روه ابو يعلى وابن عساكر شرح حياة الصحابة ٢ /٦١٦)

اللہ کے رسولﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے لئے یہودیوں کی کتاب کی تعلیم حاصل کرو، اس لئے کہ خدا کی قسم مجھے ان پر اپنی کتاب کے متعلق اعتماد نہیں ہے، تو میں نے اسکو سیکھ لیا، اور میں حضورﷺ کی جانب سے لکھتا تھا، جب آپﷺ ان کو لکھنا چاہتے تھے، اور جب وہ کچھ لکھ کر حضورﷺ کے پاس بھیجتے تھے تو میں ان کے خطوط ورسائل پڑھتا تھا۔

اسی طرح کنزالعمال میں عربی ادب وشعر میں مہارت پیدا کرنے سے متعلق حضرت عمرؓ کے ارشاد گرامی نقل کئے گئے ہیں، بقدر ضرورت علم انساب عربی ادب، اور علم نجوم سیکھنے کی روایت حضرت ابو ہریرۃؓ سے منقول ہے:

''فرمایا کہ: تم علم الانساب بھی اتنا سیکھو جس سے رشتہ داریوں کو پہچان کر حق ادا کر سکو، پھر رک جاؤ، اتنی عربی زبان بھی سیکھو جس سے قرآن فہمی پیدا ہو، پھر رک جاؤ، اتنا علم نجوم بھی حاصل کرو جس سے خشکی تری کے راستے معلوم کر سکو پھر رک جاؤ''(کنز العمال ۱۰/ ۲۲۵/ رقم الحدیث/۳۹۱۶۲)

یہ احادیث یہ اندازہ کرنے کے لئے بالکل کافی ہیں کہ عہد اول کے نظام تعلیم میں جس چیز کی ضرورت ہوتی تھی بقدر ضرورت صحابہ کرام وہ بھی سیکھتے تھے، مثلا حضرت علیؓ نے جب نحو کی ضرورت محسوس کی تو ابوالاسود دولی سے فرمایا:

ان الأعاجم قد دخلت فی الدين كافة فضع للناس شيئا يستدلون به على صلاح ألسنتهم
(كنزالعمال ١٠/ ٢٨٤۔رقم الحديث۔٢٩٤٥٧)

اس وقت عجمی لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہوئے ہیں، تم لوگوں کیلئے ایسے اصول مرتب کر دو جس سے وہ زبان کی درستگی اور اسکی اصلاح کر سکیں''

حاکم نے مستدرک میں روایت نقل کی ہے کہ:

حضرت عبداللہ ابن زبیر کا حال یہ تھا کہ انکے سو غلام تھے، جو الگ الگ زبان جانتے تھے، حضرت ابن زبیر ہر ایک سے اسی کی زبان میں بات کرتے تھے، (شرح حیاۃ الصحابہ ۳/۶۱۶)

آج ہمارے مدارس، اور ارباب مدارس کو اپنے تعلیمی ڈھانچہ کو سامنے رکھکر یہ غور کرنا چاہئے کہ وقت کی ضرورت کیا ہے، زمانہ کی آواز کیا ہے، آج اعتدال غائب ہے، یا تو افراط ہے یا تفریط ہے، ضرورت ہے کہ توازن پیدا کیا جائے۔

اہل علم کی ذمہ داری اور عوام کا فرض

عہد نبوی میں جہاں تعلیم وتعلم اور اشاعت علم کا سلسلہ جاری تھا، کوئی شخص اس چشمہ جاری سے محروم نہیں رہتا تھا، بلکہ لوگوں کو ہدایت تھی کہ جاننے والے نہ جاننے والوں کو سکھائیں جنکے کان

آشنائے علم اور جن کے قلوب اس دولت سے مالا مال تھے، ان کا فرض تھا کہ اس دولت پہ خود سانپ بن کر نہ بیٹھیں، اپنی الگ دنیا نہ بسائیں، بلکہ نا آشنائے علم اور نور بصیرت سے محروم انسانوں کو اس دولت سے حصہ دیں، انہیں علم سکھائیں، اسی طرح عوام الناس کی ذمہ داری تھی کہ وہ خود تلاش کریں اور علم سیکھیں، اندھیروں میں رہنے کے عادی نہ بنیں، بلکہ اجالوں کے جویا و متلاشی ہوں، مدرسہ نبوت کے پڑھنے والے ہر طالب علم کو حکم تھا کہ:

''ألا فليبغ الشاهد الغائب'' جو سبق میں موجود ہے، وہ غیر موجود لوگوں کو جا کر بتائیں، علماء کی ذمہ داری اور عوام کے فرق کی طرف آپ ﷺ نے ایک حدیث میں بڑی صفائی بلکہ سختی کے ساتھ اشارہ کیا ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا:

''خدا کی قسم لوگوں کو اپنے پڑوسیوں کو ضرور بالضرور علم سکھانا، سمجھانا، تعلیم دینا، نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا چاہئے، اور نہ جاننے والے لوگوں کو اپنے عالم پڑوسیوں سے سیکھنا سمجھنا اور تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے، ورنہ میں ان کو دنیا میں سخت سزا دوں گا۔'' (شرح حیاۃ الصحابۃ ۳/ ۵۹۵ کذا فی الکنز)

رحمۃ اللعالمین کے ان سخت کلمات اور عتاب آمیز کلام کو بار بار غور سے پڑھنا چاہئے، کیونکہ ہر انسان یا تو عالم ہوگا یا جاہل، اور اگر دونوں شکلوں میں کسی طرح بھی کوتاہی کی تو مجرم قرار پائے گا، ارباب مدارس اور اہل علم و دانش غور کریں کہ آج خود ان کا نظام تعلیم کس مقام پر ہے، انہوں نے اپنے اس دینی فرض کو کس حد تک ادا کیا ہے، یا کم از کم عوام کے اندر اس ذمہ داری کا شعور و احساس کس حد تک بیدار کیا ہے، یورپ نے ہر شخص کیلئے تعلیم کے ضروری ہونے اور جہالت کو جرم و عیب قرار دینے کا تصور اسلام سے لیا ہے، وہ کسی زمانے میں اندھیروں کا پرستار تھا، آج اسلامی احکام و ثقافت سے استفادہ کر کے اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور ہم غافل ہیں۔ ع

''جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے''

صحابہ کا ذوق اشاعت علم

تعلیم و تعلم سے اشتغال اور ہمہ وقت، ہمہ دم علم سے تعلق میں صفہ نبوی کے تلامذہ کا حال یہ تھا کہ کوئی موقع، کوئی وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے، جہاں بھی کوئی موقع پاتے تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع ہو جاتا، ہر مسجد ان کا اسکول تھی، انکا ٹائم ٹیبل خود ان کا ذوق و جستجوئے علم تھا، ہر فرد طالب علم بھی تھا اور جتنا سیکھ لیتا تھا اسکی اشاعت کیلئے استاد کے فرائض بھی انجام دیتا تھا، خود معلم انسانیت اپنے تلامذہ کا جائزہ لیتے تھے، ابو یعلیٰؒ نے حضرت انسؓ کی روایت نقل کی ہے:

''حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ابو موسی اشعری اپنے گھر میں بیٹھے تو لوگ ان کے پاس جمع ہو گئے، تو حضرت ابو موسی اشعری ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کرنے لگے، ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا، اللہ کے رسول! ابو موسی اشعریؓ کی ایک عجیب بات آپ کو بتاؤں، وہ ایک گھر میں بیٹھے ہیں، لوگ ان کے پاس جمع ہیں، اور وہ ان کو قرآن پڑھ کر سنا رہے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم مجھے بھی اس مجلس میں کسی ایسی جگہ بیٹھا سکتے ہو کہ کوئی مجھے نہ دیکھ سکے، اس شخص نے کہا کہ ہاں ضرور، آپ ﷺ چلے، اور اس شخص نے آپؐ کو ایسی جگہ بیٹھا دیا جہاں سے آپؐ کو کوئی نہیں دیکھ رہا تھا، آپ ﷺ نے ابو موسی اشعریؓ کی تلاوت کو سنا اور پھر (از راہ تعریف) فرمایا یہ تو بالکل داود کے لحن اور ترنم میں پڑھتے ہیں'' (راہ ابو یعلی، حیاۃ الصحابۃ ۳/ ۶۶۹)

اس حیثیت سے صحابہ کرام کے ذوق کا اور مدرسہ نبوت کے مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ وہ کوئی بھی ایسا موقع جہاں وہ کچھ بھی تعلیم و تعلم کا کام کر سکتے تھے، ضائع نہیں کرتے تھے، مذکورہ بالا چند سطور سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ عہد اول کا نظام تعلیم، ان کا شوق علم، ذوق و جستجو اور تعلیم و تعلم کا طریقہ کیسا تھا، وہ علم سیکھ کر اندھیروں کے دشمن اور جہالت کے باغی بن گئے تھے، ایک مختصر سی مدت میں اونٹوں کے چرانے والے گلہ بان، بوریہ نشیں، جہالت جن کا سرمایہ تھی وہ مدرسہ نبوت سے تربیت حاصل کر کے تہذیب کی شمعیں روشن کرنے والے، علم کے پیامبر، خودی کے عارف اور نور ہدایت کے علمبردار و اساتذہ عالم بن گئے تھے۔ ع

کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

نبوی نظام تعلیم کی خصوصیات

عہد اول کے نظام تعلیم پر اگر کوئی صاحب چشم بصیرت بشرط

انصاف غور وفکر سے کام لے گا، تو یہ اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس سے بہتر نظام چشم فلک نے اب تک نہیں دیکھا ہے، موجودہ نظام تعلیم اور نبوی نظام تعلیم میں اتنا ہی بعد اور فرق ہے، جتنا کہ خود نبی کی ذات اور عام انسان میں، آج کا نظام انسانوں کو علم کے نام پر ''مہذب جانور'' بنا دیتا ہے، انسان نے بیشک علم میں، نظام تعلیم میں، اور وسائل علم میں ترقی کے میدان سر کر لئے ہیں، لیکن نتیجہ کیا نکلا ہے، صرف کھوکھلے نظریات وفلسفہ کا نام علم رہ گیا ہے، آج کے علم نے انسانوں کو ہواؤں کے دوش پر اڑنا، سمندروں کو چیرنا، پہاڑوں کو روندنا، اور خلاء کی سیر کرنا سکھا دیا ہے، دنیا کو سمیٹ کر ایک گاؤں یا بستی (Global Village) بنا دیا، لیکن علم کی روح اور مقصدیت کو دفن کر دیا ہے، انسانیت سے نفرت بلکہ اسکی تباہی کے نت نئے وسائل کو وجود بخشا ہے، انسان کے جسم سے انسانیت وہمدردی، اخلاق وشرافت کو چوس لیا، اور خودغرضی، وانانیت، بے حیائی واخلاق باختگی کے جراثیم انجکٹ (Inject) کر دئے ہیں، علم تو وہ ہے جو روح کو سنوارتا ہے، جو دل میں تڑپ، جگر میں سوز، اور انسانیت کی محبت پیدا کرتا ہے، جو خالق کے نام سے شروع ہوتا ہے اور آفاق والنفس میں پھیلے ہوئے ربوبیت کے دلائل سمجھاتا ہے، پوری زندگی کو بلکہ عالم کو اسی رنگ میں رنگنے، بچھڑے ہوئے لوگوں کا رشتہ ان کے معبود حقیقی سے جوڑنے پر آمادہ کرتا ہے، جسکے علمبرداروں میں جہالت، تاریکی اور انسانیت کی مظلومیت کو دیکھ کر بے چینی اور دل میں خلش پیدا ہوتی ہے، جس نے انسانی دنیا میں علم کے نام پر قزاقی و بے رحمی کرنے کے بجائے عالم انسانیت میں رحم وکرم کے دریا بہا دئے تھے، انسانیت کے باغ میں ایک ایسی بہار آئی تھی کہ اس کی خوشبو آج بھی مشام جاں کو معطر کر دیتی ہے، آج علم سے روح نکل گئی ہے، الفاظ رہ گئے ہیں، سوز ختم ہو گیا، بے جان فلسفہ رہ گیا، جامعیت ختم ہو گئی اور محدودیت وتنگ نظری نے اس کی جگہ لے لی ہے، محبت والفت کا عنصر مفقود ہو گیا ہے، اور خود غرضی ونفرت اور باہمی بغض وعداوت، ذاتی منفعت واستحصالی کا مزاج پیدا ہو گیا ہے، نبوی نظام تعلیم کی مندرجہ ذیل امتیازی خصوصیات تھیں۔

(۱) روح: علم کے اندر اس وقت ایک روح تھی، علم بے جان لاش نہ تھا، اس کا اشارہ قرآن کی اس آیت سے ملتا ہے، ''إنــمـــا یخشی الله من عباده العلماء'' علم ان کے اندر ایمانی اسپرٹ، سوز جگر، خشیت الہی اور جذبہ صدق وفا پیدا کر دیتا تھا، یہ اس علم ہی کا کمال تھا کہ ایک طرف محراب میں عابد وزاہد ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے، اور دوسری طرف مجاہدین عشق شوق شہادت میں چند کھجوریں کھانا بھی گراں سمجھتے تھے،

(۲) مقصدیت: نبوی نظام تعلیم کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس وقت تلامذہ میں علم کا مقصد زندہ تھا، ان کا علم، ان کی فکر، ان کی کاوش ومحنت کا محور صرف دو کف جو یا اسباب دنیا نہیں تھا، بلکہ ان کی شاہینی نظر میں بے مقصد یا کوتاہ مقصد علم وبال جان تھا، ان کے علم کا مقصد، غرض وغایت رضائے الہی کا حصول تھا، ان کا ہدف ٹوٹی ہوئی انسانیت کو مالک حقیقی سے جوڑنا تھا، انسانوں کو صراط مستقیم کی دعوت دیکر ہمیشہ کی جہنم سے بچانا تھا، وہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر توحید وبندگی خدا کا درس دیتے تھے، انسانیت کو مذاہب کے ظلم وجور سے نکال کر عدل ومساوات کا حسین سبق سکھاتے تھے،

(۳) عمل و تطبیق: نبوی نظام کے اندر علم صرف فلسفہ اور نظریہ نہیں تھا، بلکہ انسان کی عملی زندگی سے اس کا گہرا ربط تھا، تعلیم دماغوں میں بھرا جانے والا فلسفۂ خشک نہ تھا، بلکہ عملی زندگی کی واقعاتی، جیتی جاگتی حقیقت تھا، جو سیکھتے تھے وہ زندگی میں نافذ کرتے اور برتتے تھے، انہیں ایک ایک آیت کے ضمن میں اقوال اور استشہاد کے لئے اشعار ومفردات کے دواوین یاد نہ تھے، بلکہ وحی ربانی، واحادیث نبوی شب وروز کا لائحہ عمل تھا،

(٤) جامعیت: نظام نبوی کے پروردہ افراد نے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی نمائندگی کی، صحرائے عرب کے بوریہ نشینوں نے روم وایران، مصر وشام کو فتح کیا، یہ فتح معمولی ممالک یا عام سلطنتوں کی فتح نہیں تھی، بلکہ اس وقت کی متمدن دنیا کے سب سے بڑے نظام وتمدن، سیاست وتہذیب کی شکست تھی، ان عظیم فتوحات کے بعد پوری تاریخ میں ایک مثال نہیں ملتی کہ صحابہ نے زندگی کے کسی شعبہ میں دوسروں سے مدد لی ہو، ان کے پاس اس کے افراد نہ

ہوں، نظام مملکت، سیاست انتظام، سماجیات واقتصادیات، دفاع وقضاء کون سا شعبہ زندگی تھا جس کے افراد ان فاقہ مست بوریہ نشینوں میں نہ تھے، انہوں نے زندگی کے ہرمیدان میں ہرخلا کو پر کیا، ہرمیدان میں قیادت کی، ان کی قیادت کے زیرسایہ عظیم تمدن وجود میں آیا، آج دنیا علم وتحقیق کی جس منزل پر ہے تاریخ گواہ ہے کہ یہ ان ہی بادیہ نشینوں اور مبارک نفوس کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو صرف علم وتحقیق کے ہی علمبردار نہ تھے، بلکہ انسانیت کے سالار قافلہ، اور خدا کی سرزمین پر ہدایت بشری کے حدی خواں تھے، خاکدان ارض پر خلافت ربانی کے نافذ کرنے والے تھے، ان کی آغوش محبت میں تاریخ کے معماروں نے تربیت پائی، نظام زندگی، اورتہذیبوں کے گیسوئے برہم کے پیچ وخم درست ہوئے، اقبال مرحوم نے اسی لئے کہا تھا۔

تمدن آفریں، خلاق آئین جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارہ
سماں الفقر فخری کا رہا شان امارت میں
بآب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبا را
غرض میں تجھ سے کیا کہوں وہ صحرانشیں کیا تھے
جہاں گیرو جہاں دار وجہاں بان و جہاں آرا

یہی خصائص ہیں جوموجودہ نظام تعلیم میں غائب ہیں، آج کے نظام میں ان ہی تین الفاظ؛ روح، مقصدیت اور تطبیق وعمل کا فقدان ہے، جس کی وجہ سے علم وتمدن کے مرکزوں میں جاہلیت کے جراثیم پل رہے ہیں، آج کے متمدن اورعلم کا دعوی کرنے والوں نے اپنے دامن سے جہالت کے داغ تو دھولیا ہے مگر افسوس کہ جاہلیت کے پنجوں سے نہ بچ سکے، ہرمفکر اپنی فکر پر نازاں ہے، وہ اپنے گرد ثناخوانوں اورمریدوں کودیکھکر خوش ہوتا ہے، اگراپنے حلقۂ اثر میں اپنے سے اوپرکسی کودیکھتا ہے تو بے چین ہوجاتا ہے، حسد کا شکار ہوتا ہے، یقیناً اس سے انکارنہیں کہ اہل مدارس نے دین کی بہت خدمت کی ہے، قابل ستائش ہے کہ آج ہرمسجد وگاؤں میں، ہرقریہ میں مدرسہ ومکتب کا نظام قائم کردیا گیا ہے، لیکن ان گنت فارغین وفضلاء کی جماعت کے باوجود دنیا کس رخ پر جارہی ہے، جہالت خصوصا مسلمانوں کا مابہ الامتیاز کیوں ہے، حالانکہ صفہ نبوی کے چند تلامذہ نے دنیا میں انقلاب برپا کردیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے کایاپلٹ کردی تھی، یہ صرف نبوی نظام تعلیم سے دوری کا نتیجہ ہے، کہ ہم اپنے سرمایہ سے غافل پستی وشکست خوردگی کی زندگی گذاررہے ہیں، آج اگر یہ سوال کیا جائے کہ مدارس نے، ارباب حل وعقد نے فرض کفایہ کی تعلیم کا حق خوب ادا کیا ہے، فرض عین تعلیم۔ جس سے کوئی بھی کلمہ گو مستثنی نہیں ہے۔ کے لئے ہمارے پاس کیا نظام ہے، اس کا جواب آج ہم فلسفیانہ گفتگو کے ذریعہ دے سکتے ہیں، لیکن یہ سوال پتھر کی طرح ایک سنگین حقیقت ہے جس سے کوئی مفرنہیں، تعجب کہ لوگ خوش ہوجاتے ہیں کہ ہم نے حق ادا کردیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جہالت کے اندھیروں اور طوفانی موجوں میں ہماری بادبانی کشتی ہمیں پارنہیں لگا سکتی، اہل علم مدارس چہاردیواری کے اندر بیٹھ کر چند کتابوں کے متون پڑھا کر صرف قیل وقال کی دنیا میں مگن ہیں، انہیں باہر کی کوئی فکرنہیں، انہیں نہ مسافروں کے بے کسی وبے بسی کا علم ہے، اور نہ طوفان کی خبر، نہ کشتی کی شکستہ حالی سے واقف ہیں نہ ہی خطرات سے آگاہ، ہمارا فرض ہے کہ نبوی علم کے چشمہ فیاض سے دنیا کو سیراب کریں، ہمارے پاس ایسا نظام مرتب ہوجس سے ہرفرد مستفید ہو، معاشرے کے ہرطبقہ میں علم نبوی کا فیض عام ہو، افسوس کہ یہ حالت صرف نظام نبوی سے دوری کا نتیجہ ہے، ہمیں اعتراف ہے کہ اہل مدارس نے واقعی دین کی خدمت کی ہے، قابل ستائش لائق شکر ہیں وہ لوگ، نیز اگرعلم کا تقدس اور کچھ قدرومنزلت ہے تو وہ بھی صرف مدارس میں ہی ہے، اس کی بھی وجہ ظاہر ہے کہ یہ صرف تعلیم نبوی سے انتساب کا نتیجہ ہے، لیکن جوفرض تھا وہ واقعی ابھی ادا نہیں ہوا ہے، ہمیں اپنے آپ کو، اپنے نظام کو نبوی نظام تعلیم سے ہم آہنگ کرنا چاہئے،

تری آنکھوں سے مدرسہ نے چھپایا جن کو
خلوت کوہ وبیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

☆☆☆

تحلیل وتجزیہ

مدراس کا نصابِ تعلیم

ابوفہدرامپوری

یہ ایک مختصر سا مضمون ہے، جسے بھاری بھرکم حوالوں سے بوجھل کرنے کے بجائے صحافیانہ مزاج اورطرز پر سپرد قرطاس وقلم کیا گیا ہے۔اس میں صاحب مضمون نے اپنے تجربات اور افکار سیدھے سیدھے بنا کسی تمہیداور لاگ لپیٹ کے بیان کردئے ہیں۔ یہ جانی بوجھی، سوچی سمجھی، دیکھی سنی اور بڑی حد تک برتی ہوئی زندگی کا محکم اور سادہ بیان ہے،اس استدعا کے ساتھ کہ:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم رازِ درونِ میخانہ

یہ مضمون اقبال کے اِس شعر سے ایک ذرا سے اختلاف اور ایک ذرا سے اتفاق کے ساتھ پیش ہے، اتفاق یہ کہ اقبال محرمِ راز تھے اور کم ازکم درونِ مدرسہ کی حد تک محرم راز ہونے کا شرف صاحب مضمون کو بھی حاصل ہے اور اختلاف یا فرق یہ کہ اقبال نے شاعری کی اور کہا کہ ان کی شاعری کو (محض) شاعری نہ سمجھنا، جبکہ صاحب مضمون نے شاعری نہیں کی۔

مدارس کے نصاب میں تبدیلی یا عدم تبدیلی کا مسئلہ ایسا ہے کہ اس موضوع سے متعلق اس بھری پُری دنیا میں ''جتنے منہ اتنی باتیں'' ہیں، بلکہ خاص اس تعلق سے تو یہ کہنا بھی شاید رَوا رکھا جاسکے کہ منہ کم ہیں اور باتیں زیادہ ہیں یا پھر یہ کہ بس باتیں ہی باتیں ہیں۔ جسے دیکھو وہ سوالوں، مشوروں، وضاحتوں، امیدوں اور شکایتوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست لئے کھڑا ہے اور پھر اس پر طرّا یہ کہ ان میں سے اکثر باتیں، سوال، مشورے، وضاحتیں، شکایتیں اور پھر امیدیں انتہائی حد تک ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد بھی ہیں اور ایک قاری اس وقت اپنی ہنسی یا پھر غصے پر ضبط کرنے کے قابل نہیں رہ پاتا جب وہ دیکھتا ہے کہ ایک ہی شخص کے یہاں تضاد اپنی آخری انتہاؤں تک پہنچ گیا ہے۔

مشوروں اور وضاحتوں کی بہتات میں بعض ایسے مشورے بھی دئے جارہے ہیں جو ایک دوسرے کو کالعدم ٹھہراتے ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں قبول کرنے والا کنفیوزن میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ کسے قبول کرے اور کسے رد کردے،اختلاف اور تضاد کی اسی نوعیت کے چلتے اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ دلیلیں بے کار ثابت ہوجاتی ہیں اور بڑے اچھے اچھے لکھاڑی بے اعتبار اور بے ثبات ٹھہر جاتے ہیں۔خاص اس معاملے میں ایسا بھی ہے کہ غیر تو غیر اپنے بھی اس بات کے شاکی نظر آتے ہیں کہ یہاں سنتا کون کس کی ہے؟ اور جو لوگ سننا نہ چاہیں انہیں سنانے کا فائدہ ہی کیا ہے۔اور پھر مزے کی بات یہ بھی ہے کہ ہر کس وناکس سنانے کے لئے مضطرب بھی ہے۔کوئی ممبر پر کھڑا ہے،کوئی ٹی وی کے پردے پر جلوہ گر ہے اور کوئی پرنٹ میڈیا کے صفحات پر دھرنا دئے بیٹھا ہے۔

اگر آپ لوگوں سے ملیں اور ان سے سوال کریں کہ مدارس کے نصاب میں کیا کیا اور چیزیں شامل ہونی چاہئیں، تو خدا کی قسم ایک موچی سے لے کر ایک سائنسداں تک جتنے بھی افراد چھوٹے بڑے پیشوں سے وابستہ ہیں وہ سب کے سب اپنے اپنے پیشوں اور ہنر کے متعلق یہ ضرور کہیں گے کہ ان کا پیشہ یا ہنر مدارس کے نصاب میں ضرور شامل ہونا چاہئے۔اور جب مولانا اشرف علی تھانوی پوسٹ آفس اور ٹریفک کے اصولوں کو بھی مدارس کے نصاب میں شامل کرنے کی بات کرتے ہیں تو بھلا پھر اور کونسی چیز اس دنیا میں ایسی ہے جس کی ضرورت مدارس کے نصاب میں شامل کرنے کی نہ ہو، سائنس، میڈیکل سائنس، ادب، طب، جغرافیہ، قانون، اقتصادیات، لسانیات، بینکنگ، سیرو سیاحت،

انجینئر نگ، مارکیٹنگ، ٹیکنالوجی، نینو ٹیکنا لوجی، میڈیا ،سوشل میڈیا، پرنٹنگ، کمپیوٹر، کڑھائی سلائی جیسی سیکڑوں چیزیں، موضوعات اور ہنر ہیں اور پھر اپنی اپنی تمام تر جزئیات اور لواحقات کے ساتھ ہیں اور کیا ان میں سے کوئی ایک بھی چیز، موضوع یا ہنر ایسا ہے جس کی ضرورت اور اہمیت پوسٹ آفس اور ٹریفک کے اصولوں سے کم ہے اور اسے اس کی اسی کمتر اہمیت یا ضرورت کی وجہ سے مدارس کے نصاب سے الگ رکھا جا سکتا ہے۔؟

اگر آپ عصری علوم کے ماہرین سے اس بابت رائے لیں گے تو ان میں سے سب نہیں تو کم از کم زیادہ تر افراد قرآن وحدیث اور ان سے متلقہ موضوعات جیسے تفسیر، فقہ، علم اسماء الرجال، میراث ، نحو وصرف اور انشاء وبلاغت کے علاوہ دنیا بھر کی تقریبا ہر شے، ہر موضوع اور ہر ایک فن کو مدارس کے نصاب میں شامل کرنے کی وکالت کریں گے۔اور پھر ایک بار جب ان وکالتوں کے چلتے مدارس کے نصاب میں ان تمام وکیلوں کی تمام مطلوبہ چیزوں اور موضوعات کو شامل نصاب کرلیا جائے گا تو یہی سب منفعل مزاج وکیل اور سرفروش قسم کے افراد اس پر ہنسیں گے اور کہیں گے کہ یہ نصاب ہے یا مکسڈ اچار۔اور اس وقت شاید مدارس کے تعلیم یافتہ کچھ ایسے حضرات کو اپنی حماقت کا احساس ہوگا جو باہر کے لوگوں سے کوئی ایک بات سن لیتے ہیں اور اسے اس طرح لے اڑتے ہیں جس طرح موسم گرما میں گوریا میدان سے سوکھے تنکے چنتی ہے اور پھر سے اپنے گھونسلے کی طرف اڑ جاتی ہے۔اس واضح فرق کے ساتھ کہ وہ کم از کم اپنے میدانِ عمل کی حد تک نسیمِ صبح کی طرح روشن ضمیر ہے اور بہتر طور پر جانتی اور سمجھتی ہے کہ کونسا تنکا مناسب ہے اور کونسا مناسب نہیں ہے۔

تمیزِ خار وگل سے آشکارا
نسیمِ صبح کی روشن ضمیری

نسیمِ صبح خار اور گل دونوں کے پاس آتی ہے مگر دونوں کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کرتی، وہ جانتی ہے کہ اسے گل کو نازک بنانا ہے اور خار کو سخت جان کہ فطرت کو ایک کے اندر نرمی ولطافت مطلوب ہے اور دوسرے کے اندر تیزی اور صلابت۔

دراصل نصاب سے متعلق اس خاص معاملے میں بلکہ ہر خاص وعام معاملے میں سب سے بڑا فرق مقصدیت اور اہداف کا ہے۔کسی بھی چیز کو قائم کرنے اور اسے قائم رکھنے کے پس پردہ سب سے اہم بات یہی ہوتی ہے کہ اسے قائم کرنے والے اس سے کس طرح کے اہداف اور مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔اگر وہ چیز یا ادارہ مطلوبہ اہداف حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہے تو دونوں میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہے نہ ادارہ اور نہ ہی ادارے کو قائم کرنے اور اسے آگے بڑھانے والے افراد۔ایسے وقت میں ان کے لیے ان تمام معاون علوم وفنون، اقدامات اور تبدیلیوں پر غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے جو مطلوبہ اہداف کو حاصل کرنے کے لیے کسی بھی نوعیت سے مددگار اور کارآمد ہو سکتے ہیں جبکہ دوسرے علوم وفنون جو ان مطلوبہ اہداف کو حاصل کرنے میں معاون نہ ہوں بلکہ ان کے اندر یک گونہ یا صد گونہ مغایرت ہو تو وہ کسی بھی صورت غور وخوض کے لائق نہیں، اب چاہے وہ زندگی کے دوسرے میدانوں میں سب سے فائق اور اعلیٰ وبرتر مضامین کی حیثیت ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔اب اگر مدارس کا مقصد ایک انسان کو شریعت کا ماہر بنانا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر اسے معرفت الٰہی کے مقام تک پہنچانا ہے اور اس کو اللہ ورسول اللہ ﷺ اور علم دین سے محبت کرنے والا بنا نا ہے تو انہیں اپنے یہاں کسی بھی فن یا علم کو جگہ دینے سے پہلے سو بار غور کرنا ہوگا کہ وہ خاص فن یا علم انہیں مطلوب اہداف کو حاصل کرنے والے ان کے نظام میں مزید قوت پیدا کرے گا، اسے رفتار دے گا یا اسے کمزور بنا دے گا۔یہ دیکھے اور جانے بغیر کسی بھی قسم کی وکالت پر بھروسہ کرنا نری حماقت ہوگی، اب چاہے یہ وکالتیں کرنے والے اپنے اپنے فیلڈ اور میدان میں اپنے زمانے کے رستم اور افلاطون ہی کیوں نہ ہوں۔مگر یہ دین وشریعت اور مدارس کے لیے مخلص نہیں ہیں یا مخلص تو ہیں مگر ان کے مقاصد اور اہداف وہ نہیں ہیں جو مدرسے کے بنیادی مقاصد اور اہداف ہیں تو پھر ایسے وکیلوں کو دور ہی سے سلام کرنا بہتر ہے۔اور ان سے یہ کہنا مناسب ہے کہ "پایل کے غموں کا علم نہیں، جھنکار کی باتیں کرتے ہیں"۔

ہاں اگر ایسے افراد جو مدارس کے مقاصد اور اہداف کو سمجھتے ہیں، ان کے دکھ درد کو جانتے ہیں اور ان میں سے کسی کو مدارس اور اہل مدارس کے تعلق سے اپنے تئیں یہ دعویٰ ہے کہ "میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ" تو ایسے کسی فرد کی رائے کو اہمیت نہ دینا اور محض عصبیت یا اپنے لگے بندھے مزاج اور یا چڑی مار کی سی افتادِ طبع کے

باعث یکسر نکار دینا بھی نہ صرف یہ کہ اپنی ذات کے ساتھ ناانصافی ہے بلکہ پوری قوم کے اور دین اسلام کے ساتھ بھی اسی طرح ناانصافی اور بددیانتی ہے۔

آج کی تاریخ میں اگر مدارس کے نصاب ونظام کے تعلق سے اتنی ساری باتیں بلکہ چہ میگوئیاں ہورہی ہیں تو یہ سب محض تعصب کی بنیاد پر نہیں ہوسکتیں بلکہ کچھ نہ کچھ تو ہے جس کے باعث لوگوں کو لگتا ہے کہ مدارس کے نصاب تعلیم کو اِس طرح نہیں بلکہ کسی اور طرح پر ہونا چاہئے اور طریقۂ تدریس کسی حد تک اُس سے مختلف ہونا چاہئے جو کہ فی الوقت رائج ہے۔

جو محرم راز ہیں اور زمینی حقائق پر نظر رکھتے ہیں اور اپنی رائے بناتے یا اظہار کرتے وقت انہیں خاطر میں بھی لاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مدارس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے کئی پریشانیاں لگی ہوئی ہیں۔ایک تو یہی ہے اور شاید سب سے بڑی بھی ہے کہ اہل مدارس جن علوم وفنون کی آبیاری کرنا چاہتے ہیں اور جن اصولوں ، انسانی قدروں اور تصورات وخیالات کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں وہ آج کی مادی دنیا میں جہاں ہر چیز کی قیمت مقامی یا عالمی بازار میں اس کی مادی قدر و قیمت سے متعین کی جاتی ہے، بالکل ہی بے حیثیت اور بے وقعت ہوگئے ہیں۔آخر کیا وجہ ہے کہ صاحب حیثیت مسلمان بھی جب اپنے بچوں کو کسی حافظ، قاری یا عالم دین سے قرآن یا عربی پڑھوانا چاہتے ہیں تو انہیں اتنے پیسے بھی نہیں دیتے کہ ان کی آمد ورفت کا خرچہ ہی نکل جائے جبکہ یہی لوگ جب اپنے بچوں کو انگلش، حساب یا دوسرے کسی بھی فن کی تعلیم دلانا چاہتے ہیں تو یہ ہوم ٹیوٹر کو ہر گھنٹے کے حساب سے ہزاروں روپے دیتے ہیں۔گرچہ یہ ایک بہت چھوٹی سی اور اپنا بہت ہی محدود اور مختصر پس منظر رکھنے والی مثال ہے تاہم اس سے پتہ چلتا ہے کہ مدارس میں جن علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی ہے ان کا کسبِ معاش سے کوئی تعلق نہیں ہے۔خدا پردۂ غیب سے انہیں کچھ عنایت فرمادے تو فرمادے جہاں تک ان کی تعلیم کی بات ہے تو وہ انہیں کچھ نہیں دیتی۔اہل مدارس کے جو لوگ کمائی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ان میں سے اکثر وہ ہیں جو اپنی تعلیم کے علاوہ دیگر سورسز اور ہنر مندیوں کے ذریعہ ہی کماتے ہیں۔یا پھر کمانے والوں میں زیادہ تعداد ان کی ہے جو نسبتاً اچھے گھروں سے ہیں اور ان کی مالی پوزیشن پہلے ہی سے مستحکم تھی۔یا پھر وہ ایسے افراد ہیں جو معروف علمی خانوادوں سے تعلق رکھتے ہیں۔اور ان کے لیے ہزاروں راستے کھلے ہیں کمانے کے بھی اور ترقی کے بھی۔

کچھ مدارس کا استثنا کر کے ملک کے زیادہ تر مدارس غریب اور فقیر ہیں۔اس کی وجہ سے خاص طور پر ایسا ہے کہ وہ بہت پہلے سے کوئی منظم منصوبہ بندی نہیں کرسکتے۔بوند بوند اور قطرہ قطرہ پیسہ آتا ہے اور روزمرہ کی چھوٹی بڑی ضروریات پر خرچ ہوتا چلا جاتا ہے۔ایسے میں کہاں کی پلاننگ اور کہاں کی منصوبہ بندی۔اور رہی سہی کسر وہ لوگ پوری کردیتے ہیں جو مدارس کو ایک کاروبار کی حیثیت سے چلا رہے ہیں،انہیں مدرسے،قوم اور قوم کے غریب بچوں کی فکر کم ہے ،اپنی اور اپنے بال بچوں کی فکر زیادہ ہے۔گرچہ ایسے لوگ کم ہوں گے مگر ان کی وجہ سے تمام مدارس کا اعتبار داؤ پر لگ جاتا ہے۔ایسے لوگوں کی نشاندہی بھی کسی نہ کسی حد تک ضروری ہے کیونکہ ان کی وجہ سے تمام مدارس بدنام ہوتے ہیں اور مدارس جن کے نظام کی ریڑھ کی ہڈی لے دے کر ایک خصوصی یا عوامی چندہ ہے بھاری خسارے سے دوچار ہوجاتا ہے۔

مدارس کو جو بچے ملتے ہیں ان میں زیادہ تر پسماندہ خاندانوں سے ہوتے ہیں، جب ان کے ماں باپ ہی کے اندر کوئی امنگ اور جوش وجذبہ نہیں ہوتا تو وہ بھلا اپنے بچوں کو کیا جذبہ اور امنگیں دے پائیں گے۔وہ انہیں نہ علمی تعاون دے سکتے ہیں اور نہ ہی مالی۔مدارس کے ایسے بچوں کے لیے ان کے گھر والے بھی کسی طرح کا سہارا نہیں بن پاتے۔ان کے والدین کے سامنے کوئی خاص مقصد یا ہدف نہیں ہوتا۔بس وہ کسی کے کہنے پر یا خود اپنے شوق کی وجہ سے انہیں مدرسے میں بھیج دیتے ہیں۔اتنا سوچ کر کہ تھوڑا بہت پڑھ لکھ جائیں گے، یا پھر محض اس سوچ کی وجہ سے کہ ان کا بچہ حافظ یا مولوی بن جائے گا تو وہ خود اپنے لئے اور ان کے لیے جنتیں کما پائے گا۔یہ اور ایسی ہی کئی اور وجوہات کے تحت اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مدارس میں آنے والے زیادہ تر بچے تعلیم مکمل کئے بغیر ہی مدرسہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔اور تعلیم ادھوری چھوڑ کر جانے والے بچوں کا مستقبل تاریک ہوجاتا ہے، کیونکہ ان کے پاس ڈگری نہیں ہوتی اس لیے وہ کالج یا یونیورسٹیز بھی نہیں جا پاتے۔

میں جب مدرس تھا تو میں نے درجہ دوم سے لے کر درجہ پنجم تک

کے تقریباسو بچوں سے تحریری طور پران کی رائے جاننی چاہی تو آپ یقین جانیں کہ ان میں سے ایک دو کے علاوہ کسی نے بھی یہ نہیں لکھا کہ وہ تعلیم مکمل کر کے درس وتدریس سے وابستہ ہوجائے گا۔ساتھ ہی یہ بھی بتاتا چلوں کہ یہ مدرسہ ایسے علاقہ میں واقع ہے جہاں دینی رجحان دیگر علاقوں کی بنسبت بہت زیادہ ہے، بڑے سے بڑے تاجر اوراعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات بھی پختہ دینی شعور یا پھر کم ازکم پختہ دینی رجحان رکھتے ہیں۔یہ غور کرنے کی بات ہے کہ ان بچوں نے اس بات سے کیوں گریز کیا کہ وہ اپنا مستقبل اسی مدرسے یا تعلیم سے وابستہ رکھیں گے جس سے وہ اس وقت یعنی زمانہ طالب علمی میں وابستہ ہیں۔کسی نے کہا کہ وہ دبئ چلا جائے گا، کسی نے اپنے والد کا بزنس سنبھالنے کی بات کہی اور کسی نے کوئی ہنر سیکھنے کی بات کی۔وجہ صاف ہے کہ وہ جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کرر ہے ہیں وہ انہیں دن رات دیکھ رہے ہیں کہ وہ معاشی طور پر تنگ دست ہیں، وہ اپنا تمام تر وقت مدرسے کو دیتے ہیں اور وہاں سے اتنا بھی نہیں پاتے کہ اپنے دو بچوں کا پیٹ پال سکیں اور انہیں اچھی تعلیم دلا سکیں۔حالانکہ ان میں کئی اساتذہ باصلاحیت، محنتی اور ایماندار بھی ہوتے ہیں مگر ان کی صلاحیتیں اور محنتیں بھی بہت زیادہ کام نہیں آتیں، الا ماشاء اللہ۔اس کے برعکس اگر یہی بچے یہ دیکھتے کہ ان کے اساتذہ عزت اورشان کی زندگی جیتے ہیں، ان کے پاس علم بھی ہے اور گزر بسر کے لائق کمائی بھی ہوجاتی ہے تو ان میں سے کم ازکم نصف بچے ایسی زندگی کو اپنانے کی تمنا ضرور کرتے۔پتہ نہیں ایسا کیوں ہے؟ اس کا لازمی سبب غربت اور تنگدستی ہے یا پھر اہل مدرسہ نے اپنا یہ ذہن بنالیا ہے کہ وہ مدرس کو مناسب تنخواہ دینا ہی نہیں چاہتے۔یہ سوچنے کی بات ہے کہ جب مدارس عالیشان عمارتیں بنا سکتے ہیں تو مدرس کو موجودہ زمانے کے حساب سے مناسب تنخواہ کیوں نہیں دے سکتے۔

مدارس کو بچے اس طرح نہیں ملتے جس طرح اسکولوں کو ملتے ہیں۔اسکولوں میں بچے ڈھائی تین سال کی عمر میں مل جاتے ہیں اور تمام تر توجہ اوراہتمام کے ساتھ ملتے ہیں جبکہ مدارس کو ایک عمر گزر جانے کے بعد ہی ملتے ہیں اور بنا کسی توجہ اوراہتمام کے ملتے ہیں، ایک بار مدرسے میں چھوڑ دیئے گے اور پھر ہمیشہ کے لئے بھلادئے گئے۔ان میں سے کئی بچے اپنی عمر کے آٹھ دس سال اپنے گاؤں یا محلے کی مسجد یا مکتب کی نذر کردیتے ہیں اور پھر کسی اچھے مدرسے کا رخ کرتے ہیں، جبکہ کچھ بچے حفظ کرتے کرتے ہی پندرہ سولہ سال کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں اور چودہ پندرہ سال کی عمر میں عربی تعلیم شروع کرتے ہیں، جس کا راست نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ بچے صرف عالمیت یا فضیلت سے فراغت حاصل کرتے کرتے پچیس چھبیس سال کے ہوجاتے ہیں۔پھر طرفہ یہ ہے کہ ان میں سے کچھ افراد فراغت کے بعد یونیورسٹیز کا رخ کرتے ہیں اور پھر اعلی تعلیم کے نام پر آٹھ دس سال وہاں صرف کرتے ہیں، تو اس طرح ایک بڑا طویل دورانیہ ہوجاتا ہے، اتنے طویل دورانیے سے اسکولوں کے بچے عموماً نہیں گزرتے۔جس زمانے میں ان کے والدین کو ان کی طرف سے مالی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے اس زمانے میں بھی وہ پڑھائی ہی کرر ہے ہوتے ہیں۔

مدارس کے نظام اور نصاب کو مزید فعال اور مؤثر بنانے کے لیے دو کام یا دو طرح کی تبدیلیاں زیادہ کارگر نظر آتی ہیں۔ایک یہ کہ ابتدائی درجات میں کم از کم درجہ پنجم تک کے درجات میں اسلامیات سے متعلق کتابیں یا مضامین کم کر کے چندان مضامین کا اضافہ کیا جائے جو اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔اس عمر میں زیادہ سے زیادہ توجہ سیکھنے کے عمل پر ہونی چاہیے بنسبت مطالعہ بڑھانے اور فکر وشعور کو پختہ کرنے کے۔مثلاً لکھنا، پڑھنا اور بولنا سیکھایا جانا چاہیے۔نیز متعدد زبانیں سیکھنے پر پوری توجہ ہونی چاہیے کہ زبانیں سیکھنے کی یہ بہتر عمر ہے، مطالعہ تو ایسا ہے کہ آدمی زندگی بھر کرتا رہتا ہے بلکہ بعد کی عمر کا مطالعہ زیادہ فکر اور گہرائی لئے ہوئے ہوتا ہے۔یہ اپنے آپ میں خاصی قابل قدر بات ہے کہ پندرہ بیس سال کا طالب علم ایک سے زائد زبانیں کم ازکم پڑھنا جانتا ہو۔آگے چل کر جب وہ تحقیقی کام کرے گا تو یہ زبانیں اس کے بہت کام گی اور وہ اس لائق ہوگا کہ اپنے تحقیقی عمل میں اصل کتابوں کے حوالے دے سکے گا۔اسلامیات پر زیادہ اور بھرپور توجہ عالیہ، علیا اور درجاتِ تخصص میں ہونی چاہیے۔

اگر یہ نہیں کریں گے تو ہم دیکھیں گے آنے والے چند سالوں میں شاید و باید ہی مدرسے کا کوئی طالب علم فراغت کے بعد خود کو مکمل سمجھے گا۔جب تک وہ یونیورسٹی نہیں جائے گا اور وہاں سے بی اے، ایم اے اور ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل نہیں کرے گا وہ

خودکو ناقص اورادھورا سمجھے گا۔مدارس کے بعد یونیورسٹیز میں آنے کا جو رجحان چل پڑا ہے یہ کئی لحاظ سے خاصہ بہتر اور مفید معلوم ہوتا ہے،اس کے باعث مدارس کے فارغین دوسرے میدانوں میں بھی جارہے ہیں اوراپنے آپ کومنوارہے ہیں،مگرآنے والے دن کم از کم مدارس کے حق میں خوشگوار ہونے والے نہیں ہیں۔مدارس کی حیثیت یونیورسٹیز کے ذیلی مکاتب کی ہوکررہ جائے گی،چاہےان کی خودمختاری اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ ہی موجود کیوں نہ رکھی جائے۔اگر اسی طرح سے مدارس کے فارغین یونیورسٹریز کی طرف آتے رہےتو مدارس کی افادیت کم از کم اعلیٰ تعلیم کی سطح پر بالکل ہی صفررہ جائے گی۔اب تو صرف اتنا ہے کہ مدارس کی ڈگری سرکاری سطح پر قابل قدرنہیں سمجھی جاتی ،آنے والے وقت میں ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ سماجی اورمعاشرتی سطح پربھی بے وقعت ہوجائے گی۔مدارس کے فارغین اپنے نام کے ساتھ جب تک بی اے،ایم اے اورڈاکٹر کا لاحقہ نہیں لگائیں گے کوئی انہیں صاحب علم نہیں سمجھے گا،شایدوہ خودبھی نہیں۔یہ بات اپنے آپ میں خاصی تعجب خیز ہے کہ ہندوستان کے بڑے مدارس بھی پی ایچ ڈی یا اس کے مساوی کوئی ڈگری نہیں دیتے۔حالانکہ وہ اس کا اہتمام بہت ہی خوبی اورشان کے ساتھ کرسکتے ہیں۔

دوسری بڑی تبدیلی یا اضافہ یہ ہونا چاہئے کہ مدارس اپنے یہاں مختلف فیکلٹیاں قائم کردیں۔جس طرح حدیث،تفسیر،فقہ اورعربی ادب وغیرہ کے شعبے الگ الگ قائم ہیں اسی طرح مدارس خاص اپنی نگرانی میں ، بلکہ اگرجگہ اورموقع ہوتو اپنے ہی کیمپس میں طب، قانون،صحافت ،میڈیکل سائنس، ادب ،لسانیات، اقتصادیات اورکمپیوٹر سائنس و انجینئرنگ وغیرہ کے شعبے قائم کردیں۔اب چاہےان شعبوں میں پڑھانے کے لیے باہر کے ماہرین ہی کی مدد کیوں نہ درکار ہو۔جب یونیورسٹیزاپنے یہاں اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ کھول کروہاں اسلامیات سے متعلق بہت کچھ پڑھاسکتے ہیں تو مدارس اپنے یہاں الگ الگ چندشعبے قائم کرکے قانون،سیاست، صحافت،ادب اوراقتصادیات جیسے مضامین کیوں نہیں پڑھاسکتے۔کم ازکم بڑے مدارس توایسا کسی نہ کسی پیمانے پرکرہی سکتے ہیں۔

یہ دو کام کرنے سے مدارس کی اہمیت اور کارکردگی میں بہت اضافہ ہوجائے گا اور پھرکوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ مدارس سے صرف مولوی ہی کیوں نکلتے ہیں۔بات یہ نہیں ہے کہ کوئی کیا کہتا ہے یا کیا نہیں کہتا، بلکہ بات تو یہ ہے کہ مدارس اپنی افادیت اور کارکردگی میں کس قدر اضافہ اوروسعت پیدا کرپارہے ہیں۔

اور ہاں! اب یہ دونوں طرح کے کام کوئی انہونے نہیں رہ گئے ہیں۔اب ایسی کوششیں جابجانظر بھی آرہی ہیں،مدارس کے فارغین اپنے بچوں کوابتدائی مکاتب میں بھیجنے کے بجائے پرائمری اسکولوں میں بھیجنے کوترجیح دے رہے ہیں، یہ عام مشاہدے میں آنے والی بات ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ بھی ہورہا ہے کہ جن فارغینِ مدارس کواللہ نے صلاحیت واستعداداورتوفیق سے نوازا ہے وہ اب ابتدائی درجات کے نئے مدارس یا مکاتب کھولنے کے بجائے پرائمری اسکول کھول رہے ہیں۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ مدارس کے ساتھ ہمدردیاں بلکہ گہری وابستگیاں اورعقیدتیں رکھنے والے بھی زمانے کی ہوا کوسمجھ رہے ہیں اورتبدیلیوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔اورانہیں کہیں نہ کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہیں مدارس کے متوازی ایک دوسرا نظام کھڑا کرکے دکھانے کی ضرورت پرتوجہ دینی ہوگی۔شایدوہ کہیں نہ کہیں یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان کے لئے مدارس کے نصاب میں اصلاحات کومنوانا مشکل ہے جبکہ مدارس کے متوازی نظام کھڑا کرنا شاید قدریآسان ہے۔اوروہ اسی دوسری چیزکوترجیح دے رہے ہیں۔

کچھ سال پیشتر ڈاکٹر اسراراحمدؒ کا ایک بیان سنا تھا جس میں وہ بتا رہے تھے کہ انہوں نے مولانا علی میاں ندویؒ کے سامنے اپنی یہ رائے بھی رکھی تھی کہ ندوہ کے طلبہ کومختلف ادیان کے مابین تقابلی مطالعہ کی طرف توجہ دلائی جائے، یہاں سے کچھ بچے ایسے بھی نکلیں جومختلف ادیان کے درمیان تقابل کرنے کے اہل ہوں اور مختلف ادیان کے چوٹی کے علماء سےان کےاوراپنے دین پر گفتگو یا ڈبیٹ کرسکیں۔اور جہاں تک مجھے یادرہ سکاہےانہوں نےسنسکرت زبان پڑھانے کی بات بھی رکھی تھی۔ابھی چند ہی سال پہلے فقہ اکیڈمی دہلی سے ڈاکٹر اوصاف احمد اور مولانا خالدسیف اللہ رحمانی کی سرپرستی میں ایک خاصی ضخیم کتاب تیار کی گئی ہےجس میں اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ مدارس میں اقتصادیات کی تعلیم کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے یانہیں،اقتصادیات کوشامل نصاب کرنے کے کیا فائدے ہوں گے اور کیا نقصانات۔اور یہ جوکئی حضرات مسلم سائنسدانوں کے حوالے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پہلے زمانے میں ایک ہی درسگاہ

سے عالم بھی نکلتے تھے اور سائنٹسٹ بھی بلکہ کئی بار ایسا ہوتا تھا کہ ایک ہی شخص جو عالم دین ہوتا تھا وہی سائنٹسٹ بھی ہوتا تھا۔ جابر بن حیان، ابوبکر الرازی، الفارابی، ابوالقاسم الزہراوی، ابن الہیثم، ابن سینا، علی ابن ربان الطبری، الکندی جیسے سیکڑوں مسلم سائنسدانوں کی جو لمبی چوڑی فہرست وقتاً فوقتاً سنائی اور دکھائی جاتی ہے، بلکہ موجودہ زمانے کے علماء کو خاص طور پر دکھائی جاتی ہے، اس سے پیدا شدہ پہلا اور آخری سوال یہی تو ہے کہ مدارس سے اب سائنسداں کیوں نہیں نکلتے اور پھر نتیجے کے طور پر ابھرتا ہوا ایک دوسرا مگر اہم سوال یہ بھی ہے کہ مدارس میں ایسا نصاب کیوں نہیں پڑھایا جاتا جو پہلے کی طرح سائنسداں بھی پیدا کرسکے۔ اس بات کے ادنیٰ احساس کے بغیر کہ آخر یہ سب وہ خود بھی تو کرسکتے تھے، آخر ان کے سامنے کونسی ایسی بڑی رکاوٹیں تھیں کہ وہ خود جابر بن حیان اور ابوبکر الرازی کے ہم پلہ نہ بن سکے اور پھر یہ کہ وہ خود کو کیوں اتنی آسانی سے مستثنیٰ کرلیتے ہیں۔ اور پھر دوسرے میدانوں سے وابستہ افراد خاص کر علماء دین کو جو عموماً شرعی علوم سے گہری وابستگیاں رکھتے ہیں انہیں کیوں مستثنیٰ نہیں کرپاتے۔ یہ تو سراسر زیادتی اور غیر سنجیدگی ہی کہلائی جائے گی۔

اور اس کا علاج یہ نہیں جیسا کہ اکثر لوگ رائے دیتے ہیں کہ مدارس کے نصاب ہی میں ساری چیزیں داخل کردی جائیں بلکہ اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا کہ مدارس درجات علیا اور فضیلت میں مختلف علوم فنون کے شعبوں میں اضافہ کریں، جیسا کہ معہد العالی حیدرآباد میں اسلامک فائنانس کا شعبہ شروع کیا گیا ہے۔ باقی مدارس بھی اپنے یہاں ایک ایک یا دودو دیگر شعبہ جات شروع کردیں۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کا اہتمام کریں۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے مگر پتہ نہیں کیوں یہ بات بہت سارے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی، وہ بس ایک ہی بات کہتے ہیں کہ مدارس کے موجودہ نصاب میں ہر طرح کی اور ہر ایک علم وفن کی کتابیں ٹھونس دی جائیں۔ اور یہ نری بے تکی بات ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ ایک ہی عالم دین، شرعی علوم کے ساتھ ساتھ دیگر تمام فنون میں بھی مہارت رکھتا ہو اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ دنیا کے ہر قابل ذکر علم وفن پر ماہرانہ نظر رکھنے والے چند عالم دین ہر زمانے میں موجود رہیں اور یہ ممکن بھی ہے۔

یہ حماقت بھرا سوال یا تمنا ہے کہ لوگ ایک عالم دین کو بیک وقت عالم اور انجینئر، ڈاکٹر اور سیاست و اقتصادیات کا ماہر دیکھنا چاہتے ہیں۔ سوشل سائٹ پر کسی کھردری طبیعت کے مالک نوآموز وکیل نے یہ سوال بھی کردیا کہ مولویوں نے آج تک کونسی چیز ایجاد کی ہے۔ جبکہ دنیا ایجادات سے بھردی گئی ہے اور مولوی حضرات خود بھی ان ایجادات سے استفادہ کررہے ہیں۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ اب آپ سے ڈائریکٹلی یہ سوال پوچھا جائے گا کہ خود آپ نے یا آپ کے باپ دادا نے کبھی کوئی چیز ایجاد کی ہے۔؟ اور ان ڈائریکٹلی یہ سوال بھی کہ دنیا کے کونسے بڑے سیاسی یا سماجی لیڈر نے کبھی کونسی چھوٹی یا بڑی چیز ایجاد کی ہے۔ اگر نہیں تو پھر ایک عالم دین سے کیوں یہ خواہش رکھی جاتی ہے کہ وہ ایک طرف تو شرعی علوم میں بھی مہارت رکھے اور دوسری طرف اپنے معاشرے کو کوئی چیز ایجاد کرکے بھی دے۔ ظاہر ہے کہ وہ پیشے سے وکیل تھے اور اپنے بارے میں ان کا یہی تصفیہ تھا کہ سائنسی ایجادات سے کسی وکیل یا جج کا بھلا کیا تعلق، مگر یہی بات وہ ایک عالم دین کے حق میں ماننے کے لئے تیار نہیں۔ میں یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ یہ سوال صرف ایک شخص کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک خاص ذہنیت کا عکاس ہے جو لاکھوں افراد کے دماغ میں دن رات کلبلاتا رہتا ہے اور اپنی تمام تر نامعقولیت اور غیر سائنسی رویئے اور طرز کے باوجود بھی کلبلاتا رہتا ہے۔ آخر یونیورسٹیز سے کب کونسا ایسا شخص نکلا ہے جو بیک وقت کئی مختلف اور متضاد مضامین کا ماہر ہو۔ ہاں یہ ہوتا ہے کہ یونیورسٹیز سے تقریباً تمام مضامین کے ماہر نکلتے ہیں اس لیے کہ وہاں تمام مضامیں الگ الگ شعبوں میں پڑھائے جاتے ہیں اور یہ اہل مدارس بھی کرسکتے ہیں اور انہیں اس کے لیے بس وہی کرنا ہے کہ وہ اپنے یہاں چند فیکلٹیز کا اضافہ کردیں، پھر آپ دیکھیں گے کہ انہی مدارس سے لسانیات اور اقتصادیات کے ماہر بھی نکل رہے ہیں اور سافٹ ویئر وہارڈ ویئر انجینئرز بھی، ڈاکٹرز بھی اور ایجادات کرنے والے بھی اور ان سب کی ایک عالم دین کی حیثیت بھی مسلم ہوگی یا کم از کم دین کے معاملے میں ان کی رائے کا احترام کیا جائے گا۔ شاید پھر کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ مدارس صرف مولوی ہی پیدا کررہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کل دنیا بھر کے بینکوں میں اسلامی مالیات کے غیر سودی شعبے قائم کئے جارہے ہیں اور انہیں ایسے علماء کی ضرورت رہتی ہے جو شریعت کے ساتھ ساتھ اقتصادیات میں

بھی مہارت رکھتے ہوں۔اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مدارس کے کچھ فضلاء اقتصادیات کی ڈگری بھی حاصل کریں، چاہے مدرسے کے اندر کریں یا مدرسے سے باہر یونیورسٹیز کے کیمپس میں۔

ایسا کرنا کچھ خاص مشکل نہیں ہے کہ پورے ملک سے اگر ہر سال ایک ہزار طلبہ شرعی علوم کی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں تو ان میں سے کم از کم ایک سو طلبہ ایسے بھی ہونے چاہئیں جو شرعی علوم کی ڈگریوں کے ساتھ دیگر علوم میں سے کسی ایک علم کی ڈگری بھی حاصل کریں۔اس طرح اہل مدارس تمام موضوعات کا احاطہ کرسکنے کے قابل ہوسکیں گے۔اور پھر ہر موضوع پر بولنے اور لکھنے کے لیے عالم دین موجود ہوں گے۔اس کی ایک ممکنہ شکل یہ بھی ہے کہ تمام بڑے بڑے مدارس اور تنظیمیں جو تعلیمی ادارے بھی چلاتی ہیں عصری تعلیمی موضوعات کو اپنے درمیان اس طرح تقسیم کرلیں کہ تمام کے تمام موضوعات پڑھانے کا انتظام ہوجائے، کسی مدرسے میں صحافت کا شعبہ کھول دیا جائے اور کسی دوسرے میں اقتصادیات کا اور کسی تیسرے میں سائنس کا۔اور یہ آپسی اتحاد اور ایک دوسرے کے تعاون کے طور پر ہو۔اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ایک ہی مدرسے پر تمام موضوعات کا بار نہیں پڑے گا۔

مگر اس کام میں سب سے بڑی اور پہلی رکاوٹ وہ خاص ذہنیت ہے جو مدارس اور اہل مدارس کا خصوصی طرۂ امتیاز ہے اور وہ ہے مسلک پسندی اور فرقہ پرستی، خاص اس وجہ سے ایسا ہے کہ مدارس کے مابین کوآپریٹو سسٹم موجود نہیں ہے، ایک مسلک سے تعلق رکھنے والا طالب علم دوسرے مسلک کے مدرسے میں تعلیم حاصل نہیں کرسکتا، حتیٰ کہ پرائمری تعلیم بھی نہیں اور نہ ہی ایک مدرسے کا فارغ دوسرے مدرسے میں پڑھا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی چھوٹی موٹی جاب کرسکتا ہے یہاں تک کہ کلرک اور چپراسی کی جاب بھی نہیں۔یہ عدم رواداری اور مسلک پرستی کی انتہا ہے۔اور جب تک یہ چیز رہے گی تب تک اہل مدارس کچھ نہیں کرسکیں گے چاہے وہ کتنی بھی طاقت کیوں نہ صرف کرلیں اور اخلاص وللہیت کے بلند مقام تک ہی کیوں نہ پہنچ جائیں۔

جس زمانے میں ہم جی رہے ہیں اس میں ہمیں تین طرح کی بے اعتباریوں کا سامنا ہے۔اور شاید سب سے بڑی بے اعتباری تو یہی ہے کہ انسان بحیثیت انسان آج کی متمدن دنیا میں اپنی قدر و قیمت کھوچکا ہے۔آج انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو جس قدر ارزاں ہے اس قدر ارزاں شاید اس سے پہلے زمانے کے کسی بھی پڑاؤ پر اور زمین کے کسی مقام پر نہیں رہی ہوگی۔اور یہ ارزانی ہمہ شمہ تقریبا سب ہی کا حصہ ہے، شاید ان کا بھی جن کی زندگیوں میں ہمیں بہت زیادہ چمک دھمک دکھائی دیتی ہے۔

دوسری بے اعتباری مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہے۔اس خاص حوالے سے خاص و عام ہر دو طرح کے مسلمانوں کی بے اعتباری کو بین الاقوامی حیثیت اور شہرت حاصل ہوگئی ہے۔شاید ہی کوئی زمانہ ایسا گزرا ہو جب وہ زمانے کی آنکھ میں اس قدر ہلکے اور بے اعتبار ہوئے ہوں۔تاتاریوں کے غلبے کے زمانے میں بھی شاید اس قدر بے اعتبار نہیں رہے ہوں گے یا پھر کم از کم یہ کہ اس وقت کی بے اعتباری کی حیثیت عالم گیر نہیں تھی۔آج کی تاریخ میں مسلمانوں کے پاس ایک تعلیم اور علم و ہنر کو منہا کرکے بہت کچھ ہے، ان کے پاس قدرتی وسائل بھی بہت ہیں اور عددی اعتبار سے بھی وہ قابل ذکر حیثیت رکھتے ہیں مگر بھی پھر زمانے کی آنکھ میں ان کی بے اعتباری دیکھنے کی چیز ہے۔

تیسری قسم کی بے اعتباری دینی شعار اور تشخصات کے حوالے سے ہے۔آج مسلمان خود مسلمان ہی کی نظر میں بے اعتبار ہے اور اگر خدانخواستہ اس کا مزاج اور رجحان دینی اقدار اور اسلامی روایات سے زیادہ تال میل رکھتا ہے اور اس نے اپنا اوڑھنا بچھونا ممبر ومحراب اور مدرسہ و دستار کو بنا رکھا ہے تو پھر تو اس کا کوئی اعتبار ہی نہیں ہے، نہ صرف یہ کہ زمانے کی نظر میں نہیں ہے بلکہ خود اس کے ہم مذہبوں کی نظر میں بھی نہیں ہے، شاید اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہنا مناسب ہو کہ خود اس کی اپنی نظر میں بھی نہیں ہے۔

ایسے جان گسل حالات اور بے توقیری و بے اعتباری اور بے سروسامانی کے عالم میں اگر معدودے چند افراد یہاں وہاں یا ادھر ادھر کہیں نہ کہیں اپنے دین وایمان، اقدار و روایات اور تشخصات اور ترجیحات کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اور اپنی جیسی کوششیں کررہے ہیں تو یقیناً وہ اقبال کے اِس خراج کے یقینی طور پر مستحق ہیں۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دئے ہیں انداز خسروانہ

مگر یہ تو کرنا ہی ہوگا کہ تبدیلیوں کو راہ تو دینی ہی ہوگی، اب چاہے راضی خوشی دی جائے یا پھر جبر و اکراہ کے ساتھ۔

☆☆☆

حالات حاضرہ

رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

تاریخ میں اسلامی تہذیب درخشاں تہذیب رہی ہے، اگر یہ تہذیب نہ ہوتی تو یورپ میں نشأۃ ثانیہ کا دور بھی شروع نہ ہوتا ہے، اور قرون مظلمہ کے سائے دراز تر ہو گئے ہوتے، یہ اسلامی تہذیب تھی جس نے یورپ کو روشنی عطا کی، اور وہاں علم و عقل اور نئے نظریات کا قافلہ جادہ پیما ہوا، آج بھی یورپ میں لوگوں کو اسلامی تہذیب سے خوف محسوس ہوتا ہے، اور وہاں کے بڑے بڑے مفکرین اندیشہائے دور دراز میں مبتلاء ہو جاتے ہیں اور یہ ببانگ دہل کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب کو کمونیزم کے زوال کے بعد اگر کوئی خطرہ ہے تو اسلامی تہذیب سے خطرہ ہے، اس موضوع پر ایک نہیں متعدد کتابیں یورپ میں شائع ہو چکی ہیں، اور بڑی۔تعداد میں فروخت ہوئی ہیں، اور بڑی چالاکی کے ساتھ یورپ اور امریکا نے مسلم دنیا پر اپنا شکنجہ کس لیا ہے، اور بحیثیت مجموعی مسلم ممالک بے بس ہو چکے ہیں، یہ موضوع بڑا وسیع ہے، ہم اس وقت صرف اس تہذیبی یلغار کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جس کا سامنا ہندوستان میں مسلمانوں کو کرنا پڑ رہا ہے

ہندوستان میں دائیں بازو کی طاقتیں یہ غم نہیں بھول سکیں کہ مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال تک ہندوستان میں حکومت کی ہے، اور آج بھی اسلام میں اتنی طاقت ہے کہ وہ یہاں کی آبادی متأثر کر سکتا ہے، چنانچہ یہ دائیں بازو کی طاقتیں متحد ہو کر پچاس سال تک بتدریج کوشش کرتے کرتے برسر اقتدار آ گئیں، اور برسر اقتدار آنے کے بعد کھل کر کے مسلمانوں کے خلاف ان کی زبانیں چلنے لگیں، اور ان کے دل کے اندر جو ارادے ہیں وہ اور بھی خطرناک ہیں، اور صورت حال وہ ہے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے ”**قد بدت البغضاء من افواههم وما تخفی صدورهم اكبر (آل عمران ۱۱۸)**“ ”یعنی“ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے“، ہندوتو کے قائدین علی الاعلان یہ کہنے لگے ہیں کہ ۲۰۲۱ تک ہم ہندوستان کو مسلمانوں اور عیسائیوں سے خالی کر کے رہیں گے اور مسلم مکت اور عیسائی مکت بھارت بنائیں گے، کبھی ان کا زبان دراز پیشوا یہ کہتا ہے کہ تمام ہندوستانیوں کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو ہندو کہیں، اور اس کے بعد یہ قائدین نہایت بے شرمی کے ساتھ حکومت سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے حق رائے دہی کو سلب کر لینا چاہیے اور کبھی گھر واپسی کے پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں گویا شدھی سنگٹھن کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کر جا رہی ہے، کبھی گورنر اور حکومت کا ذمہ دار یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتا ہے کہ جو شخص گائے کو ذبح کرے اسے ذبح کر ڈالنا چاہیے، مہاراِشٹرا کے وزیر اعلی کو یہ کہنے میں باک نہیں کہ جو بھارت ماتا کی جے نہیں کہتا اسے پاکستان چلے جانا چاہئے، بابا رام دیو کہتے ہیں کہ اگر مجھے قانون کا پاس ولحاظ نہیں ہوتا تو بھارت ماتا کی جے نہ کہنے والے لاکھوں انسانوں کے سر کاٹ دیتا، مسلم کش فسادات کا سلسلہ جو آزادی کے بعد سے مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے سے شروع ہوا ہے وہ رکا نہیں ہے، دادری میں گائے ذبح کرنے کے جھوٹے الزام کے تحت ”اخلاق“ کا خون کر دیا گیا، اسکولوں میں سوریہ نمسکار اور یوگا کو لازمی قرار دیا جاتا ہے، وندے ماترم اور سرسوتی وندنا پر اسکول کے طلبہ کو مجبور کیا جاتا ہے، تعلیم کا بھگوا کرن کیا جاتا ہے، گیتا کو قومی کتاب قرار دینے کی آواز بلند کی جاتی ہے، یہاں تک کہ حج سے روکنے کی بھی بات کی جاتی ہے، اور اب بھارت ماتا کی جے کہنے پر اس درجہ مجبور کیا جا رہا ہے کہ جو شخص اس نعرے کو بلند کرنے سے انکار کرے وہ گویا قوم پرست اور محبّ وطن نہیں ہے، ہردوار اور گول والکر اور ساورکر کے جارحانہ نظریات اب بہ تدریج عملی شکل اختیار کرنے لگے ہیں۔اس تہذیبی جارحیت پر سب کا ساتھ سب کا وکاس کا پردہ ڈال دیا گیا ہے مسلم پرسنل لا کو ختم کر کے مسلمانوں کے تشخص کو ختم کرنے کی کوشش اب پہلے سے زیادہ تیز اور

شدید ہوگئی ہے،عدالتوں کے کئی فیصلے مسلم پرسنل لا کے خلاف ہوچکے ہیں۔اردو زبان کے سلسلہ میں معاندانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے اوراب مسلمانوں کی دو تین نسلیں اردو زبان سے بے بہرہ ہوکر رہ گئی ہیں، قانون حق معلومات کے تحت ایک مسلم نوجوان کو آرمی میں صرف اسلئے معلومات نہیں دی گئیں کہ اس کا تعلق مذہب اسلام سے تھا، مرکزی حکومت میں ایک وزارت ایورویدک، ہومیو پیتھک، یونانی، نیچرو پیتھی کے فروغ کیلئے قائم کی گئی تھی اس میں ملازمت کیلئے تین ہزار آٹھ سو اکتالیس مسلمانوں نے درخواست دی تھی لیکن ایک بھی مسلمان کا تقرر نہیں ہوا،ایک معروف صحافی پشپ شرما نے آرٹی آئی میں جواب مانگا تو جواب دیا گیا کہ حکومتی پالیسی کے تحت کسی مسلم امیدوار کو انٹرویو کے لئے نہیں بلایا گیا، یہ سب دستور کی دفعہ ۱۴ (مساوی حقوق) کی کھلی خلاف ورزی ہے، صورت حال یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ مہاتما گاندھی کے قاتل گوڈسے کو شہید کا درجہ دیا جارہا ہے، ہندو خواتین کو مشورہ دیا جارہا ہے کہ بھارت میں ہندو مذہب کو بچانے کیلئے چار چار بچے پیدا کریں، مرکزی وزیر گری راج سنگھ نے الکشن کے موقعہ پر کہا تھا کہ جو لوگ نریندر مودی کو وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں دیکھنا چاہتے ہیں انہیں ملک چھوڑ دینا چاہئے، اب تعلیمی اداروں پر قبضہ کرنے کی کوشش ہورہی ہے جواہر لال نہرو یونیورسیٹی مشہور یونیورسیٹی ہے جہاں کی اکثریت ہندوتو کی مخالف ہے وہاں کے بارے میں زی ٹی وی نے یہ خبر اڑائی کہ وہاں ملک دشمن نعرے لگائے گئے تھے، جواہر لال نہرو یونیورسیٹی کو تخریب کاری کا اڈا ثابت کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔فروغ وسائل انسانی کی مرکزی وزیر نے تمام تعلیمی اداروں میں قومی پرچم کا لہرانا ضروری قرار دے دیا ہے، تعلیمی اداروں کی آزادی اور خود مختاری ختم کی جارہی ہے جھوٹی حب الوطنی کے ایسے حالات پیدا کئے جارہے ہیں کہ آج پورے ملک میں طلبہ برادری کے اندر خوف وہراس پایا جارہا ہے یونیورسیٹی سے طلبہ کا اخراج کیا جارہا ہے، حکومت اساتذہ اور طلبہ کے حوصلوں کو پست کرنا چاہتی ہے تاکہ کوئی سیکولرزم اور جمہوریت اور آزادی رائے کی بات نہ کرے، RSS کے سربراہ موہن بھاگوت کہتے آئے ہیں ہندوستان کے تعلیمی نظام کو ہندوؤں کے عقائد پر مبنی ہونا چاہیے، فلم میں بہت سے نام کے مسلمان ایکٹر بھی ہیں، ان پر عدم رواداری کا الزام ہے۔اب مسلمانوں کی صف سے ایک خاص مسلک ومشرب کے لوگوں کی کانفرنس کرکے مسلمانوں کے درمیان میں دراڑ ڈالنے کی کوشش بھی ہونے لگی ہے اور ایسے لوگوں کو پورے طور پر کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوگئی ہے۔مسلمان معاشی اعتبار سے خستہ حال ہیں، مسلمان تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہیں، مسلمانوں کا سرکاری نوکریوں میں وجود نہیں کے برابر ہے، فوج اور پولیس میں مشکل سے ان کا کوئی نشان ملتا ہے البتہ جیلوں میں وہ سب سے زیادہ ہیں اور اسپتالوں میں ان کا تناسب زیادہ ہے، اب یہ کمزور اور بے وسیلہ مسلمان کیا کریں اور کہاں جائیں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ پورے ملک کو ایک خاص کلچر میں ضم کردینے کی کوشش ہورہی ہے یہ مشرکانہ کلچر ہے جسے مسلمان کسی حال میں قبول نہیں کرسکتے، اس لئے نشانہ کے زد پر خاص طور پر مسلمان ہیں چنانچہ مسلمانوں سے انتقام لینے کیلئے مسلم نوجوانوں کو دہشت گردی کے نام پر گرفتار کیا جارہا ہے اور بسا اوقات فرضی انکاونٹر کے ذریعہ انہیں ہلاک بھی کیا جاتا ہے۔اسی مسلم دشمنی کا شاخسانہ ہے کہ مسلم یونیورسیٹی اور جامعہ ملیہ کے اقلیتی کردار کو چھیننے کی کوشش ہورہی ہے، اب ملک میں عدم رواداری اپنے شباب پر ہے اور اس کا احساس صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ انصاف پسند اور صاف ذہن کے برادران وطن کو بھی ہے اسی لئے انہوں نے بڑی تعداد میں احتجاج کر کے طور پر حکومت کو اپنے ایوارڈ بھی واپس کردئے۔جہاں تک ممکن ہوسکا میں نے اختصار کے ساتھ حالات کا جائزہ لیا ہے حالات بہت سخت اور سنگین سہی لیکن ان ہی جانگسل حالات میں ہمیں اپنی تمام کوششیں بھی جاری رکھنی ہیں بقول شاعر

"رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ"

پس چہ باید کرد

ان حالات میں مسلمانوں کے لئے راہ عمل کیا ہے؟ میں یہاں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں جو راہ عمل میں پیش کرنے جارہا ہوں نہ یہ اہل علم سے مخفی ہے اور نہ یہ حالات جن کا ذکر اوپر آیا ہے وہ کوئی پردہ خفا میں ہیں۔ان کا بار بار دہرانا تحصیل حاصل ہے، صرف سوال یہ ہے کہ عملی اقدام کیسے کیا جائے اور نظریہ کو عمل کا جامہ کیسے پہنایا جائے، سستی کاہلی بے عملی کیسے دور کی جائے، مسلمانوں کے اندر قوت ارادی کیسے پیدا کی جائے تمام مسئلوں کا اصل مسئلہ، تمام مشکلات کا سرچشمہ یہ ہے کہ قوت ارادی اور قوت عمل ہم سے چھن گئی ہے۔ہم حالات بھی جانتے ہیں اور حل بھی جانتے ہیں اور اس حل تک پہنچنے کا شوق بھی رکھتے ہیں، لیکن منزل کی طرف قدم آگے نہیں بڑھاتے ہیں، ہماری تمام نکبت اور

ناسازگاری اور حرماں نصیبی کا سبب بس یہی ہے، ہم گفتار کے غازی ہیں کردار کے غازی نہیں ہیں، مسلمانوں کو اس ملک میں کیا کرنا ہے یہ با تیں سو بار دہرائی جاچکی ہیں اور آئیندہ بھی سو بار دہرائی جائیں گی ہم ایسی تحریر کو پڑھ کر یا تقریر کو سن کر بس محظوظ ہوتے ہیں جیسے رنگ چمن اور جوش بہار کو دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں، مسلمانوں کو اس ملک میں کیا کرنا ہے تعلیم کے محاذ پر کیا کرنا ہے سیاسی محاذ پر کیا کرنا ہے بار بار کہی جاچکی ہیں۔لیکن کوئی فائدہ نہیں، ایک شخص بڑے سے بڑے عالم مفکر صاحب قلم کے فکر انگیز مضمون کو اس طرح پڑھتا ہے جیسے دستر خوان پر گلاب جامن اکھاتا ہے پھر سب فراموش کر دیتا ہے وہی عیش وطرب کی محفلیں وہی باتوں اور حکایتوں کی مجلسیں، اس وقت مسلمانوں کو ایسی غذا، ایسی دوا، ایسی دعاء کی ضرورت ہے جو ان کے اندر قوت اردای اور قوت عمل کوٹ کوٹ کر بھر دے۔قوموں کی زندگی کا سب سے بڑا جانکسل روگ بے عملی ہے اور کوئی مسیحا اور طبیب اس کا علاج نہیں کرسکتا جب تک کہ مریض خود اپنے آپ کو ٹھیک کرنے کا عزم مصمم نہ کرلے، علم نفسیات کے اعتبار سے ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے مرض کا علاج معلوم کرنا ہوتا ہے پھر علاج اور صحت کی خواہش پیدا ہوتی ہے شاید ملت مسلمہ صرف اسی خواہش کے مرحلہ پر رکی ہوئی ہے، اگر صرف بے نام سی، دھندھلی سی خواہش پیدا ہوکر رہ گئی تو کوئی فائدہ نہیں جب تک یہ خواہش جذبہ سے، بلکہ جذب دروں سے نہ بدل جائے اس کے بعد وہ قوت اردای درکار ہوتی ہے جو جذبہ کو قوت فیصلہ سے یعنی عزم سے نہ بدل دے، پھر اس کے بعد عزم کو قوت عمل سے بدلنا ہوتا ہے، منزل کی تلاش اور منزل تک پہونچنے کی خواہش اور پھر قوت ارادی اور اس کے بعد قوت عمل، ان سب کی حیثیت سنگ میل کی ہے ان سب مرحلوں سے گذرنے کے بعد کامیابی کی منزل ملتی ہے۔عمل کے بغیر صرف خواہش کا پایا جانا کسل مندی کا وہ مرض ہے جس سے پناہ مانگی گئی ہے اللھم انی اعوذ بك من العجز والكسل اگر صرف خواہش پیدا ہوکر رہ جائے اور عمل کا حوصلہ نہ ہو تو خون آرزو انسان کا نصیبہ بن جاتا ہے بقول شاعر

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں

مرے حوصلہ کی پستی مرے شوق کی بلندی

قرآن کی آیت ہے أنتم الاعلون ان كنتم مؤمنين (آل عمران آیت ۱۳۹) یعنی تم ہی سربلند ہوگے اگر تم صاحب ایمان ہوگے۔اگر ہم قرآن پر ایمان رکھتے ہیں تو ہمیں اس حل پر بھی ایمان لانا ہوگا۔قرآن نے کہا ہے کہ ''بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ان سے کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو ہم مسلمان ہوگئے، ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا'' یہ قرآن کی آیت (الحجرات۱۴) کا ترجمہ ہے۔ہماری حالت زار بھی ان بدوؤں کی طرح ہوگئی ہے جن کے بارے یہ آیت نازل ہوئی تھی، ہمارے دلوں کے اندر بھی ایمان داخل نہیں ہوا ہے، کیونکہ ایمان جب داخل ہوتا ہے تو انسان کے اندر ایک بھونچال کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ اعمال واخلاق میں بالکل دوسرا انسان ہوجاتا ہے اس کا کردار بلند ہوتا ہے، اس کا دل خدا کے خوف سے اور خلق خدا کی محبت سے لبریز ہوتا ہے، حالات کو اگر بدلنا ہے تو اس بنیادی کام پر ہمیں توجہ مبذول کرنا چاہئے اور اگر یہ بنیادی تبدیلی ہم اپنے اندر نہیں پیدا کرسکے تو اسباب کی سطح پر ہماری تمام کوششیں ناکامی سے دوچار ہوجائیں گی۔

مسلمان جو کئی سو سال حکومت کر چکے ہیں ذلتوں سے بدتر ہوگئے ہیں ،اور R S S نے ہندو طاقتوں کو متحد کر کے اپنے نمائندے نریندر مودی کے سر پر حکومت کا تاج رکھ دیا ہے، مرکزی حکومت نے RSS کی پالیسی کا نفاذ بھی شروع کردیا ہے، یہ تو واقعی صورت حال ہے، اب سوال یہ ہے مسلمانوں کی بے کسی اور کسمپرسی کیسے ختم کی جائے اور ظلم کے طوفان اور طغیان سے ان کو کیسے بچایا جائے، کچھ امید کی سلور لائن بھی موجود ہے۔

دہلی اور بہار میں بی جے پی کی شرمناک شکست ہوچکی ہے مہاراشٹرا گجرات اور تلنگانہ کے بلدیاتی انتخابات میں بھی بی جے پی کی رسوائی ہوئی ہے، ہندوستان میں اقتدار سے بی جے پی کو دور کرنا اس وقت خالص دینی کام ہے، کیونکہ اگر لوک سبھا کے بعد راجیہ سبھا میں بھی بی جے پی کو اکثریت حاصل ہوگئی تو وہ ملک کے دستور کو بدلنے اور ملک کو ہندو راشٹر بنانے کی کوشش میں کامیاب ہوجائیں گے، پھر یہ ملک مسلمانوں کے لئے دوسرا اسپین بن جائے گا۔ضرورت اس بات کی ہے مسلمان قائدین آپس میں رابطہ قائم کریں اور اس کے لئے لائحہ عمل تیار کریں۔اور اس کام کو خالص دینی کام سمجھیں، روہیت مومیلا کی موت کے بعد دلت اور مسلم اتحاد نے بی جے پی کو حواس باختہ کردیا ہے، لیکن ان باتوں پر بہت خوشی منانے کی ضرورت نہیں، بی جے پی نے پسماندہ طبقات کو ساتھ لینے کی کوششیں بھی شروع کردی ہیں اور پسماندہ طبقات میں ایسے بہت سے لیڈر ہیں جنہیں سستے داموں پر بھی خریدا

جاسکتا ہے اب یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ دلتوں سے اس قدر قریب ہوں کہ بی جے پی کا جادوان پر نہیں چل سکے، مسلمانوں کے لئے یہ کام اس لئے بھی ضروری ہے کہ مظلوموں کا دفاع اور ظلم کا قلع قمع اور ظالم کو ظلم سے روکنا مسلمانوں کی مذہبی ذمہ داری بھی ہے اس لئے بہت بڑے پیمانہ پر مسلمانوں کو یہ کام شروع کرنا چاہئے اور ہر شہر ہر گاوں میں بلا تاخیر مسلمانوں کو اس کام کے لئے انصاف اور انسانیت کے نام سے منظّم ہونا چاہئے اپنے محلّہ اور اپنے علاقہ سے اس کام کو شروع کردینا چاہئے اور برادران وطن میں جو مظلوم ہیں ان کے ساتھ مل کر ایک پلیٹ فارم بنانا چاہئے ملک کو فاشزم سے بچانا اور برہمنزم کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنا مسلمانوں اور پسماندہ طبقات دونوں کے مفاد میں ہے، شعور کی بیداری کے لئے پورے ملک میں ہر سطح پر کوشش کرنی ہوگی،

سماجی کاموں میں خدمت خلق کا میدان بھی ہے۔ مسلمانوں کو خدمت خلق کے میدان میں بھی اترنا ہوگا اور اپنی شرافت اور شائستگی اور خیر پسندی کا نقش غیر مسلموں پر بالخصوص پس ماندہ طبقات کے دلوں پر بٹھانا ہوگا، غیر مسلموں سے تعلقات قائم کرنے کی مہم شروع کرنی ہوگی، اسلام اور مسلمانوں کے سلسلہ میں جو غلط فہمیاں ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کرنی ہوگی اور ان سب کاموں کیلئے یعنی طوفان کا مقابلہ کرنے کیلئے میدان میں اترنا ہوگا، اور اس زبان میں گفتگو کرنی ہوگی جو برادران وطن کی زبان ہے، ٹکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم اور آئی آئی ٹی کے کورسز مسلمانوں کی مضبوطی کے لئے بہت ضروری ہیں، اب روایتی تعلیم بی اے، بی ایس سی وغیرہ بے فیض اور بے فائدہ ہوگئی ہے اور جو لوگ یہ روایتی تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کو اعلی تعلیمی اداروں میں ملازمت کے لئے اور حکومت کے انتظامی عہدوں کیلئے مقابلہ کے امتحانات آئی اے ایس اور آئی پی ایس کے لئے تیار کرنا بھی مسلم قیادت کی ذمہ داری ہے اور مسلم قیادت میں ایسے لوگ ہیں جنہیں اس کا تجربہ ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کو ایک تحریک کی شکل دینے کی ضرورت ہے، مسلمانوں کو اس میدان میں آگے بڑھنا چاہئے اور تمام رکاوٹوں کے باوجود مسلمانوں کو خود اپنے ادارے دلتوں اور اقلیتوں کے ساتھ مل کر قائم کرنا چاہئے۔ یہ وہ تعلیم ہے جس میں وہ ملک کے اندر اور باہر مسلمان اپنی جگہ بنا سکتے ہیں اور معاشی استحکام لا سکتے ہیں۔ تعلیمی اور معاشی اعتبار سے خود کو مستحکم بنانے کے لئے دوسروں سے زیادہ محنت کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی اس بات کی ضرورت ہے کہ مسلمان کی یہ شناخت بن جائے کہ وہ زیادہ محنتی زیادہ ایمان دار اور اپنے پیشہ میں پختہ کار ہوتا ہے پیشہ وراہ پختگی اور لیاقت (پرفکشن) کی تعلیم ہمیں اس حدیث میں ملتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ اس بندے سے محبت کرتا ہے جو کوئی کام کرتا ہے تو اسے بہت اچھی طرح انجام دیتا ہے (اذا عمل عملا اتقنه) مثال کے طور پر ایک انسان برتن بناتا ہے اور اس میں نفاست اور پختگی اور مہارت کا ثبوت دیتا ہے تو وہ اللہ کی محبت کا مستحق بن جاتا ہے۔ ہمیں اپنے پیشہ اور میدان کار میں سخت محنت کرنا ہے اور برادران وطن سے ممتاز ہونا ہے، اس لئے کہ یہ دین بھی ہے اور دنیا میں عزت کا ذریعہ بھی ہے، اور اس کے بعد اپنی اولاد کی اچھی تعلیم و تربیت پر وقت صرف کرنا ہے وقت کو ضائع کرنے سے بچانا ہے ہمارا ایک منٹ بھی ضائع نہیں ہونا چاہئے، وقت کے تلوں سے ہمیں سارا تیل نکال لینا ہے۔ یہ ہے کامیابی اور سرخروئی کا راستہ۔ ورنہ مشکلات سے باہر نکلنے کے لئے جادو کی کوئی چھڑی موجود نہیں ہے، پردہ غیب سے مسلسل یہ آواز آرہی ہے ع

"پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے"۔

ان تمام تدبیروں کے ساتھ اس بات کی ضرورت ہے کہ مسلمان یہاں مسلمان بن کر رہیں، ان کا عقیدہ درست ہو، ان کا عمل صالح ہو، وہ باعمل مسلمان ہوں، ان کے اخلاق بلند ہوں، ان کا ایمان قوی ہو، ان میں اتحاد ہو، وہ شرافت اور شائستگی میں ممتاز ہوں، ان کی رحم دلی، خیر خواہی اور ایمانداری کا نقش لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گیا ہو، یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے جب مسلمان اپنے مستقبل کو روشن بنانے کے لئے سنجیدہ ہوجائیں۔ ایک صور اسرافیل کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگا دے، جو ان کے اندر زبونی کا احساس پیدا کردے، جو مردہ انسانوں کو زندہ کردے جو انہیں حرکت و عمل پر آمادہ کردے۔ کاش کہ ایسا ہو کہ یہ اطلاعات ملنے لگیں کہ مختلف علاقوں کے مسلمان اس آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار ہوگئے ہیں، حوادث اور مشکلات نے ان کے ایمان کو اور قوی کردیا ہے، اور انہوں نے سنجیدہ قائدین کے ساتھ مل کر خیر سگالی کا وفد بنا کر دلتوں اور پسماندہ طبقات سے اجتماعی طور ملاقاتوں کا اور ان سے مستقل رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اور کاش کہ ایسا ہو کہ ہاتف غیب کی طرف سے کانوں میں یہ صدا سنائی دینے لگے۔

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی

☆☆☆

امت محمدیہ، خصوصیات وامتیازات

محمد قمر الزماں ندوی
جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ

تیسری خصوصیت: شریعت محمدی مکمل اور آخری شریعت ہے: اسلام ایک مکمل دین اور کامل دستور العمل ہے، زندگی کے تمام شعبوں میں انسانوں کی کامل رہنمائی کرتا ہے، اور یہ آخری مکمل شریعت ہے جس میں قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل و مشکلات کا شرعی حل موجود ہے۔ اسی حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا، اور تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری کر دی، اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔

مذکورہ آیت کے نزول کی ایک خاص شان ہے، عرفہ کا دن ہے جو تمام سال کے دنوں میں سید الأیام ہے اور اتفاق سے یہ عرفہ جمعہ کے دن واقع ہوا۔ جس کے فضائل معروف ہیں، میدان عرفات جبل رحمت کے قریب ہے، جو عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزولِ رحمت کا خاص مقام ہے۔ وقت عصر کے بعد کا ہے جو عام دنوں میں بھی مبارک وقت ہے۔ اور خصوصا جمعہ کے دن اس وقت قبولیت دعا کی گھڑی ہوتی ہے جیسا کہ بہت سی روایات سے پتہ چلتا ہے۔ اور عرفہ کے روز اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ دعائیں قبول ہونے کا خاص وقت ہے۔ حج کے لئے مسلمانوں کا پہلا سب سے بڑا اجتماع ہے۔ جس میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرامؓ شریک ہیں۔ آنحضرت ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ جبلِ رحمت کے نیچے اپنی ناقہ ''عضباء'' پر سوار ہیں اور حج کے بڑے رکن یعنی وقوف عرفات میں مشغول ہیں۔

ان فضائل و برکات اور رحمتوں کے سایہ میں یہ آیت کریمہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتی ہے۔ صحابہ کرامؓ کا بیان ہے کہ جب آپؐ پر یہ آیت بذریعہ وحی نازل ہوئی تو حسب دستور وحی کا ثقل (بوجھ) اتنا محسوس ہوا کہ اونٹنی اس سے دبی جا رہی تھی یہاں تک کہ مجبور ہو کر بیٹھ گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت تقریباً قرآن کی آخری آیت ہے۔ اس کے بعد کوئی آیت اُحکام سے متعلق نازل نہیں ہوئی صرف ترغیب و ترہیب کی چند آیتیں ہیں، جن کا نزول اس آیت کے بعد بتلایا گیا ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسولِ کریم ﷺ اس دنیا میں صرف اکیاسی روز بقید حیات رہے۔ کیوں کہ ۱۰ھ کی نویں ذی الحجہ میں یہ آیت نازل ہوئی اور ۱۱ھ کی بارہویں ربیع الاول کو آنحضرت ﷺ کی وفات ہوگئی۔

یہ آیت جو اس خاص شان اور اہتمام سے نازل ہوئی اس کا مفہوم بھی ملتِ اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑی خوشخبری اور بھاری انعام اور اسلام کا طغرائے امتیاز ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دینِ حق اور نعمت الٰہی کا انتہائی معیار جو اس عالم میں بنی نوع انسان کو عطا ہونے والا تھا، وہ آج مکمل کر دیا گیا۔

گویا حضرت آدمؑ کے زمانے سے جو دین حق اور نعمت الٰہیہ کا

نزول اور ترویج شروع کی گئی تھی اور ہر زمانہ اور ہر خطہ کے مناسب حال اس نعمت کا ایک حصہ اولاد آدم کو عطا ہوتا رہا آج وہ دین اور نعمت مکمل صورت میں خاتم الانبیاء رسول اللہ ﷺ اور آپ ؐ کی امت کو عطا کر دی گئی۔

اس میں تمام انبیاء ورسل کے زمرہ میں سید الانبیاء ﷺ کی سعادت اور امتیازی شان کا تو اظہار ہے ہی اس کے ساتھ تمام امتوں کے مقابلے میں امتِ مسلمہ کی بھی ایک خاص امتیازی شان کا واضح ثبوت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کی خدمت میں ایک مرتبہ چند علماء یہود حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ تمہارے قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جو اگر یہود پر نازل ہوتی تو وہ اس کے نزول کا جشن عید مناتے۔ فاروق اعظمؓ نے سوال کیا کہ وہ کون سی آیت ہے۔ انہوں نے یہی آیت الیوم اکملت لکم دینکم الخ پڑھ دی۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ ہاں ہم جانتے ہیں کہ یہ آیت کس جگہ اور کس دن نازل ہوئی۔ اشارہ اسی بات کی طرف تھا کہ وہ دن ہمارے لئے دوہری عید کا دن تھا ایک عرفہ دوسرے جمعہ (ملخص معارف القرآن جلد سوم سورہ مائدہ)

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ شانہ نے رسول کریم ﷺ اور آپ کی امت مرحومہ کو تین خصوصی انعام عطا فرمانے کی بشارت دی ہے ایک اکمالِ دین، دوسے اتمام نعمت اور تیسرے شریعت اسلام کا اس امت کے لئے انتخاب۔

''اکمال دین'' کے معنی ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ نے یہ بیان فرمائے ہیں کہ آج دین حق کے تمام حدود وفرائض اور اُحکام وآداب مکمل کر دیئے گئے ہیں۔ اب اس میں نہ کسی اضافہ اور زیادتی کی ضرورت باقی ہے اور نہ کمی کا احتمال۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اُحکام اسلام میں کوئی نیا حکم نازل نہیں ہوا۔

دین تو ہر نبی ورسول کا ان کے زمانہ کے اعتبار سے کامل ومکمل تھا۔ یعنی جس زمانہ میں جس پیغمبر پر کوئی شریعت ودین اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا، اس زمانہ اور اس قوم کے لحاظ سے وہی کامل ومکمل دین تھا۔ اس میں کوئی نقص اور کمی نہ تھی وہ شریعت بھی اللہ ہی کی شریعت تھی اور وہ دین اللہ ہی کا نازل کردہ دین تھا۔

''اتمام نعمت'' سے مراد مسلمانوں کا عروج وغلبہ اور ان کے مخالفین ومعاندین کا مغلوب ومفتوح ہونا ہے۔ جس کا عملاً ظہور مکہ معظّمہ کی فتح، جاہلی رسم ورواج کے مٹانے اور عصبیت وقومیت اور زبان ورنگ کی بنیاد پر تفریق کے خاتمے اور اس سال حج میں کسی مشرک وکافر کے شریک نہ ہونے کے ذریعہ ہوا۔

اور اس امتِ مرحومہ کے لئے تیسرا انعام جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس امت کے لئے اللہ جل شانہ نے اپنے تکوینی انتخاب کے ذریعہ دین اسلام کو منتخب فرمایا جو ہر حیثیت سے کامل ومکمل ہے اور جس پر نجات کا انحصار ہے اور یہی دین عالمی، آخری اور ابدی ہے۔ (مستفاد معارف القرآن جلد سوم تفسیر سورۂ مائدہ)

صاحبِ تفہیم القرآن اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

کافروں کو تمہارے دین سے مایوسی ہوچکی ہے یعنی اب تمہارا دین ایک مستقل نظام دین بن چکا ہے، اور خود اپنی حاکمانہ طاقت کے ساتھ نافذ وقائم ہے۔ کفار جو اب تک اس کے قیام میں مانع ومزاحم (رکاوٹ) رہے ہیں، اب اس طرف سے مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ اسے مٹاسکیں گے اور تمہیں پھر پچھلی جاہلیت کی طرف واپس لے جاسکیں گے''لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو''یعنی اس دین کے اُحکام اور اس کی ہدایت پر عمل کرنے میں اب کسی کافر طاقت کے غلبہ وقہر اور دراندازی ومزاحمت کا خطرہ تمہارے لئے باقی نہ رہا ہے۔ انسانوں کے خوف کی اب کوئی وجہ نہیں رہی،............ (**بقیہ صفحہ ٦٤ پر**)

حدیث اور محدثین کی بابت راشد شاز کا نظریہ (۲)

الیاس نعمانی

تدوین حدیث کی بابت نظریۂ شاز:

احادیث نبویہ کی آئینی وتشریعی حیثیت کے انکار کے بعد راشد شاز کا کہنا یہ بھی ہے کہ احادیث نبویہ کو تحریری طور پر محفوظ کرنے کا جو کام امت مسلمہ کے عظیم دماغوں (صحابہ، تابعین اور بعد کے محدثین) نے کیا ہے وہ غلط ہے، اللہ اور رسول اللہ (ﷺ) کے حکم کی خلاف ورزی اور دین میں تحریف سے عبارت ہے، اتنا ہی نہیں، اس سلسلہ کے ان کے دلائل اور دعووں کا تجزیہ ذیل میں درج ہے۔

اس سلسلہ میں ان کا سب سے مضحکہ خیز دعوی یہ ہے کہ قرآن مجید نے احادیث نبویہ کے مجموعے ترتیب دینے سے منع کیا تھا، ان کا کہنا ہے کہ سورہ یونس کی آیات: ۵۷-۵۸ میں اس بارے میں صاف حکم امتناعی موجود ہے، [ادراک زوال امت: ۱/۲۶۱] آیئے شاز صاحب کے اس شاذ استدلال کا جائزہ لیتے ہیں، سورۂ یونس کی ان آیات میں ارشاد ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۵۸﴾

(ترجمہ: اے لوگو! تمہارے رب کی جانب سے نصیحت، سینوں (دلوں) کے امراض کی شفا اور اہل ایمان کے لیے ہدایت ورحمت آگئی ہے، کہہ دو کہ یہ اللہ کے فضل ورحمت کا کرشمہ ہے، تو چاہیے کہ اس پر شادماں ہوں، یہ اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کررہے ہیں)۔

شاز صاحب کا دعوی ہے کہ ان آیات میں حدیثیں جمع کرنے یا بالفاظ دیگر تدوین حدیث کی بابت "صاف حکم امتناعی موجود ہے"، آیت کے سیاق وسباق پر غور کرکے ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ شاز صاحب کا یہ دعوی بالکل بے بنیاد ہے، بلکہ قرآن مجید کی اس آیت کی تاویل بد سے بدتر کیے بغیر کوئی ذی عقل شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس آیت میں جمع وتدوین احادیث سے منع کیا گیا ہے۔

سورۂ یونس مکی سورت ہے، اور توحید، آخرت، نبی کریم (ﷺ) اور قرآن مجید کی بابت مشرکین مکہ کے اعتراضات ووساوس کا جواب اس کا موضوع ہے، درج بالا آیات سے بہت پہلے سے مشرکین مکہ اور ان کے اعتراضات کا ہی تذکرہ اور جواب چل رہا ہے، یہ سلسلہ آیت نمبر: ۳۷ سے شروع ہوکر آیت نمبر: ۷۰ تک جاری رہا ہے، ان آیات میں بار بار یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ اپنے مال واسباب پر ان مشرکین مکہ کا غرور وتکبر میں مبتلا ہونا صحیح نہیں ہے، آج اسباب دنیا کو یہ اپنے لیے باعث فخر سمجھ رہے ہیں، اور قیامت کے روز صرف عذاب سے بچنے کے لیے اپنا تمام مال برضا ورغبت بطور فدیہ دینے پر راضی ہوں گے، بلکہ اگر ان جیسے کسی شخص کے پاس پوری دنیا کا مال ودولت جمع ہوجائے تو وہ اس کو بطور فدیہ دے کر عذاب سے خلاصی چاہے گا (آیت: ۵۴)، جس مال ودولت پر آج یہ نازاں ہیں اس کی حیثیت دنیوی زندگی کے عارضی اور چندروزہ فائدہ کی ہے، پھر اللہ کے حضور ان کی حاضری ہونی ہے، جہاں شرک وکفر کی پاداش میں ان کو سخت عذاب کا سامنا کرنا ہوگا (آیت: ۷۰)۔

اسی سیاق وسباق کے درمیان شاز صاحب کی ذکر کردہ درج بالا آیات بھی ارشاد فرمائی گئی ہیں، جن میں مشرکین مکہ اور ان کے جیسے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ قرآن مجید تمہارے

رب کی جانب سے تم کو کی گئی نصیحت اور تمہارے دلوں کے امراض کی شفا ہے، اور تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئیں یہ کتاب ان کے لیے ہدایت ورحمت کا سامان ہے، ان کے درمیان اس کتاب کا نزول اللہ کے فضل ورحمت کا کرشمہ ہے، پس انہیں اس پر شادمان ہونا چاہیے، اس لیے کہ جس مال ومتاع کو جمع کر کے یہ بہت شادمان ونازاں ہوا کرتے ہیں یہ کتاب اس سے بہت بہتر ہے۔

خدا جانے اس آیت میں شاز صاحب کو تدوین حدیث کی بابت ''صاف حکم امتناعی'' کہاں سے نظر آ گیا؟ انہوں نے خود تو کچھ نہیں لکھا ہے لیکن بظاہر وہ ''هو خير مما يجمعون'' کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پائے ہیں، انہوں نے اپنے ذہن میں یہ مفروضہ کھڑا کیا کہ مکی عہد میں (جب کہ یہ سورت نازل ہوئی تھی) کچھ صحابہ نے احادیث کے مجموعے جمع کیے ہوں گے، جس پر اللہ نے یہ فرمایا ہے کہ: ''قرآن اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کر رہے ہیں''۔ شاز صاحب اگر یہ سمجھے ہیں (اور یہ سمجھے بغیر ان کا استدلال ناممکن ہے) تو ان کا یہ فہم وادراک یقیناً موجب حیرت ہے، جس سیاق وسباق میں یہ آیت آئی ہے اس میں بالکل واضح ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مشرکین جس مال ومتاع کو جمع کر کے خوش ونازاں ہیں اس سے یہ قرآن بہتر ہے، لہٰذا انہیں اس قرآن پر شاداں ہونا چاہیے۔

اگر بفرض محال شاز صاحب کی اس تشریح کو مان بھی لیا جائے تو بھی اس آیت میں قرآن کو 'ان کے جمع کیے ہوئے' سے بہتر ہی کہا گیا ہے، اس بہتر وکمتر کے فیصلہ سے 'صاف حکم امتناعی' شاز صاحب نے کہاں سے اخذ کر لیا؟ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک کتاب کو دوسری کتاب سے بہتر کہے تو اس کا مخاطب یہ دعوی کرے کہ کہنے والے نے دوسری کتاب کے مصنف کو 'صاف حکم امتناعی' دیا ہے، ایسے فہم، ایسی بصیرت، ایسے ادراک اور ایسی اجتہادی صلاحیت کے نمونے شاز صاحب کے یہاں بکثرت ملتے ہیں۔

تدوین حدیث کے خلاف شاز صاحب کی اس قرآنی دلیل کے بعد حدیثی دلیل بھی ملاحظہ فرمائیں، ان کا خیال ہے کہ آنخضرت (ﷺ) نے بھی تحریری طور پر اپنی حدیثوں کے مجموعے تیار کرنے سے روکا تھا، دیگر منکرین حدیث کی طرح انہوں نے بھی اس موقع پر اس صحیح حدیث سے غلط استدلال کیا ہے:

لا تكتبوا عني غير القرآن ومن كتب عنى شيئا فليمحه (مسلم)

(ترجمہ: قرآن کریم کے علاوہ مجھ سے سن کر کچھ نہ لکھو، جس نے [قرآن کے علاوہ] مجھ سے سن کر کچھ لکھا ہو وہ اسے مٹا دے)۔

اس حدیث کو پڑھ کر شاز صاحب کو بھی اپنے پیش رو منکرین حدیث کی طرح یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ آں حضرت (ﷺ) نے قرآن مجید کے علاوہ کچھ اور لکھنے کی جو ممانعت اپنے اس ارشاد میں فرمائی تھی وہ دائمی تھی، حالانکہ حدیث کی کتابوں میں موجود دیگر احادیث نبویہ کو اگر سامنے رکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ممانعت عارضی اور وقتی نوعیت کی تھی، ورنہ خود آنخضرت (ﷺ) نے دیگر موقعوں پر صحابہ کرام کو احادیث نبویہ تحریری طور پر محفوظ کرنے کا حکم دیا تھا، مشہور عالم دین مولانا تقی عثمانی صاحب نے اپنی کتاب حجیت حدیث میں (جو کہ ان کی انگریزی کتاب The authority of sunnah کا اردو ترجمہ ہے) اس طرح کی سات حدیثیں نقل کی ہیں جو صحیح بخاری سمیت متعدد حدیث کی کتابوں میں درج ہیں، اور جن میں خود رسول (ﷺ) نے صحابہ کو اپنی حدیثیں لکھنے کی اجازت اور اس کا حکم دیا تھا، مکمل اقتباس تو بڑا طویل ہے، مذکورہ کتاب کے تقریبا پانچ صفحات پر مشتمل ہے، ذیل میں ہم اس کا خلاصہ درج کر رہے ہیں:

۱-ایک انصاری صحابیؓ نے رسول اللہ (ﷺ) کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ آپ کے ارشادات بھول جاتے ہیں، اس پر آپؐ نے ان سے فرمایا: ''اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو، اور یہ فرما کر آپؐ نے اپنے ہاتھ سے لکھنے کا اشارہ فرمایا''۔ [سنن ترمذی: ۲/۱۰۷]

۲- حضرت رافع بن خدیجؓ کا بیان ہے کہ: میں نے رسول اللہ (ﷺ) سے پوچھا کہ ہم آپ سے بہت سی چیزیں سنتے ہیں، کیا ہم انہیں لکھ لیا کریں، آپؐ نے فرمایا: لکھ لیا کرو، اس میں کوئی حرج نہیں''۔ [تدریب الراوی: ۲۸۶، المحدث الفاصل: ۳۶۹]

۳- حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا: ''تحریر کے ذریعہ علم کی حفاظت کرو''۔ [جامع بیان العلم، ابن عبدالبر، ۲/۷۲، المحدث الفاصل: ۳۶۸]

۴- حضرت ابورافع نے رسول اللہ (ﷺ) سے احادیث لکھنے کی اجازت مانگی، تو آپ نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ [جامع الترمذی:۲/۱۰۷] مصادر سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابورافع کی تحریر کردہ احادیث بعض دیگر صحابہ نے بھی نقل کی تھیں، ابن سعد نے طبقات میں حضرت عبداللہ بن عباس کے شاگرد سلمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ: ''میں نے حضرت عبداللہ بن عباس کے پاس کچھ تختیاں دیکھیں، وہ ان پر رسول اللہ (ﷺ) کی کچھ حدیثیں لکھ رہے تھے جو انہوں نے حضرت ابورافع سے نقل کی تھیں''۔ [طبقات ابن سعد:۲/۳۷۱]

۵- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کا بیان ہے کہ ان سے رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا کہ ''علم محفوظ کرلو''، انہوں نے دریافت کیا کہ: کس طرح محفوظ کیا جائے؟ آپؐ نے فرمایا: ''لکھ کر''۔ [مستدرک حاکم:۱/۱۰۶]

٦- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کا ہی بیان ہے کہ: میں جو کچھ رسول اللہ (ﷺ) سے سنتا اسے لکھ لیا کرتا، اور اسے زبانی یاد کرنا چاہتا تھا، ایک موقع پر انہوں نے اس کا تذکرہ خود رسول اللہ (ﷺ) سے کیا تو آپ نے ان کے اس عمل کو صحیح قرار دیا، اور ان کو لکھنے کا حکم دیا۔ [سنن ابوداود:۲/۵۱۳]

اس حکم کی تعمیل میں انہوں نے احادیث کی ایک کثیر تعداد جمع فرمائی، اور اس مجموعہ کا نام الصحیفة الصادقة رکھا، ابن اثیر کا بیان ہے کہ اس مجموعہ میں ایک ہزار احادیث تھیں [اسد الغابة:۳/۲۳۳]، حدیث کی کتابوں میں جو روایتیں عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده کی مشہور سند سے ملتی ہیں وہ سب اسی مجموعہ سے روایت کی گئی ہیں۔

۷- فتح مکہ کے موقع پر آپ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا، ابوشاہ نامی ایک یمنی صحابی نے یہ درخواست کی کہ یہ خطبہ انہیں تحریری شکل میں مہیا کرادیا جائے، ان کی اس فرمائیش ودرخواست کو سن کر آپ (ﷺ) نے صحابہ کو حکم دیا: ''ابوشاہ کے لیے اسے تحریر کردو''۔ [بخاری:۱/۲۲]

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد مولانا تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

''یہ سات مثالیں اس بات کے ثبوت کے لیے بہت کافی ہیں کہ احادیث کی کتابت اور تحریر کی نہ صرف یہ کہ رسول اللہ (ﷺ) کی جانب سے اجازت دی گئی تھی بلکہ حکم دیا گیا تھا، نیز یہ کہ کتابت پر ابتدائی ممانعت محض ایک عبوری دور کے لیے تھی، تاکہ آیات قرآنی اور احادیث کے باہم مختلط ہوجانے کے ممکنہ خطرہ سے بچا جاسکے، اس وقتی دور کے بعد جب یہ ممکنہ خطرہ باقی نہ رہا تو یہ ممانعت اٹھالی گئی، اور صحابہ کرام کو ہدایت کردی گئی کہ وہ احادیث مبارکہ کو تحریری شکل میں محفوظ کریں''۔ [حجیت حدیث، مولانا تقی عثمانی:۱۳۰]

مولانا تقی عثمانی کی اس گفتگو کے بعد یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ شاز صاحب اور ان کے پیش رووں نے جو استدلال حدیث نبوی ''لاتکتبوا عنی غیر القرآن'' سے کیا ہے وہ بھی ان کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے، ورنہ اگر نگاہ صرف اسی حدیث پر اٹک کر نہ رہ جائے بلکہ متعلقہ مسئلہ کی بابت دیگر احادیث بھی نظر میں ہوں تو یہ دعوی کوئی بھی عقل سلیم رکھنے والا شخص نہیں کرسکتا ہے۔

اپنے اس نظریہ پر قرآن وحدیث سے درج بالا غلط استدلال کرنے کے بعد شاز صاحب نے یہ دعوی بھی کیا ہے کہ صحابہ کرام بھی احادیث کی تدوین وترتیب کو بہت غلط سمجھتے تھے، اس سلسلہ میں ان کی گفتگو ایسی دروغ گوئیوں سے بھری ہوئی ہے کہ جن کا تصور بھی کوئی سچا شخص نہیں کرسکتا، انہوں نے اپنے مطلب ومدعا کی باتیں صحابہ کرام کی جانب منسوب کرکے ان پر عجیب وغریب تہمتیں لگائی ہیں۔

مثلا امام ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ کے آغاز میں (۱/۵) ایک روایت حضرت عائشہ کے حوالہ سے یہ نقل کی ہے کہ میرے والد (حضرت ابوبکرؓ) نے رسول اللہ (ﷺ) کی حدیثیں جمع کی تھیں، یہ پانچ سو حدیثیں تھیں، ایک رات آپ بہت بے چین تھے، مجھے آپ کی حالت دیکھ کر بڑا رنج ہوا، میں نے عرض کیا آپ کو کوئی تکلیف ہے، یا کوئی پریشان کن خبر آئی ہے، صبح ہوئی تو انہوں نے فرمایا اے بیٹی! تمہارے پاس احادیث کا جو مجموعہ ہے وہ لے آؤ، میں لے آئی، تو آپ نے اسے جلا دیا، پھر فرمایا مجھے ڈر ہوا کہ میری موت اس حال میں ہو کہ یہ مجموعہ میرے پاس ہو، اور اس میں کسی ایسے شخص کی احادیث ہوں جسے میں نے امین وثقہ جانا ہو، اور اس نے خلاف واقعہ باتیں نقل کی ہوں، تو میں ایسی باتیں نقل کرنے کا مجرم بنوں''۔

امام ذہبیؒ نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد اس کے صحیح نہ

ہونے کا حکم لگایا ہے، ان کے علاوہ دیگر محدثین نے بھی اسے ناقابل استناد بتایا ہے۔

شاز صاحب نے اس روایت کو تو نقل کیا ہے، لیکن یہ نہیں بتایا کہ امام ذہبی اور دیگر محدثین نے اس روایت کے راویوں کی بنیاد پر اس کو غیر معتبر جانا ہے، نیز شاز صاحب نے اس روایت کو ذکر کرنے کے ساتھ جو اپنا کلام کیا ہے اس میں بہت گل کھلائے ہیں، اس میں چونکہ یہ ذکر ہے کہ ایک مجموعۂ احادیث کو حضرت ابوبکر نے نذر آتش کر دیا تھا اس لیے یہ روایت انہیں اپنے 'کام کی چیز' لگی، اور اس لیے انہوں نے اس کو نقل کیا، لیکن ان کے سامنے مسئلہ یہ آیا کہ اس روایت کو اگر قابل استناد مانا جائے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر کے نزدیک احادیث کے مجموعے مرتب کرنا صحیح تھا، یعنی ان کے نزدیک تحریری طور پر تدوینِ حدیث کا کام اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی جانب سے ممنوع نہیں قرار دیا گیا تھا، تبھی تو انہوں نے یہ مجموعہ مرتب کیا تھا، اور ظاہر ہے کہ یہ مان لینے سے شاز صاحب کے پورے دعوے کی بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے۔

روایت کے اس پہلو کو اپنے نظریہ کے خلاف پڑتا دیکھ کر انہوں نے حضرت ابوبکرؓ پر ایک عجیب وغریب تہمت یہ لگائی ہے کہ اگر چہ رسول اللہ (ﷺ) نے کتابت حدیث سے منع فرمایا تھا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے جذبات کی رو میں بہہ کر اس حدیث کی خلاف ورزی کی تھی، [ملاحظہ ہو: ادراک زوال امت: ۲۰۰/۱] اتنا ہی نہیں، شاز صاحب نے حضرت ابوبکر کی بابت یہ دروغ گوئی بھی کی ہے کہ ''صرف اس خیال سے کہ مبادا آنے والوں میں ان کی یہ تصنیف دین محمدی میں ایک نئے مشناۃ کی حیثیت اختیار کر لے، ابوبکر صدیق نے اس ہستی کے مجموعۂ اقوال کو تلف کرنے کا تکلیف دہ فیصلہ کر لیا'' [ادراک زوال امت: ۲۰۰/۱]۔

اب ذرا درج بالا روایت کو دیکھیے اور شاز صاحب کے بیانات ملاحظہ فرمائیے، روایت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے حدیث کا ایک مجموعہ مرتب فرمایا تھا، اور وہ اس کو بہت حفاظت کے ساتھ رکھتے تھے، لیکن آخر عمر میں آپ کو خیال ہوا کہ اس میں میں نے کچھ احادیث دوسروں کے حوالے سے بھی نقل کی ہیں، نہیں معلوم کہ انہوں نے اپنے بیان کردہ اقوال کو صحیح سے سمجھا تھا یا نہیں، اور نقل میں کہیں ان سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی تھی، اور اس طرح میں کہیں نادانستہ طور پر غیر حدیث کو بطور حدیث نقل کرنے کی غلطی تو نہیں کر رہا، بس اس احتیاطی جذبہ کے تحت انہوں نے اپنا یہ مجموعہ (اگر اس ضعیف ترین حدیث سے استدلال کیا جائے تو) تلف کر دیا تھا، اس میں کہاں مشناۃ کی حیثیت کا خیال آ گیا، یہ بس شاز صاحب کی کارفرمائی ہے جو مجموعہ ہائے احادیث کو مشناۃ، گمارہ اور تلمود جیسا قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

اگر اس ضعیف ترین حدیث سے استدلال کیا جائے تو اس سے بھی یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک مجموعہ حدیث مرتب ومدون کرنا بالکل صحیح تھا، وہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، اسی لیے انہوں نے یہ مجموعہ مرتب کیا تھا، اور ان کو کبھی بھی کوئی تردد اس جمع وتدوین کے عمل پر نہیں تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کے بعد شاز صاحب نے حضرت عمر کی بابت بھی کچھ اسی طرح کے دعوے کیے ہیں، حضرت عمر کی بابت اہل علم جانتے ہیں کہ وہ احادیث وروایات کو قبول کرنے کے سلسلہ میں بہت محتاط تھے، بالخصوص اگر انہیں کسی روایت حدیث کی بابت کوئی شک ہوتا تو وہ حزم واحتیاط کی روش ہی اختیار کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ لوگوں کو کثرت روایت سے منع کیا کرتے تھے، اس لیے کہ کثرت روایت کے ساتھ حزم واحتیاط کی اس قدر رعایت نہیں ہو سکتی ہے جتنی قلت روایت کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ لیکن حضرت عمر کے اس موقف کو بعض لوگوں نے غلط انداز میں پیش کیا ہے، ہمارے شاز صاحب بھی ان ہی لوگوں میں شامل ہیں، ممتاز محدث وامام حافظ ابن عبدالبرؒ نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں ایسے ہی لوگوں کی بابت لکھا ہے کہ:

''جن لوگوں کو واقعات کا صحیح علم نہیں تھا اور بدعات (نئی باتوں) کو پیدا کرنے کا جن میں زیادہ شوق پایا جاتا تھا، حدیث نبوی سے جن کے قلوب میں گرانیاں تھیں، انہوں نے مذکورہ بالا روایتوں سے جو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہیں، یہ نتیجہ پیدا کرنا چاہا ہے کہ حضرت عمرؓ مسلمانوں کے دین سے حدیثوں کو بالکلیہ خارج کر دینا چاہتے تھے'' [جامع بیان العلم: ۱۲۱/۲، منقول از: تدوین حدیث،

مولانا مناظر احسن گیلانی، ۳۳۹]۔

یہی حال شاز صاحب کا بھی ہے، انہوں نے بھی ایسی روایات کی بنیاد پر یہی غلط تاثر دینا چاہا ہے کہ حضرت عمر ”مسلمانوں کے دین سے حدیثوں کو بالکلیہ خارج کر دینا چاہتے تھے“، مثلا تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبیؒ نے حضرت قرظہ بن کعب کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے انہیں اور دیگر دو صحابہ کو عراق بھیجتے وقت یہ نصیحت کی تھی کہ:

”انکم لتأتون بلدة لأهلها دوي بالقرآن كدوي النحل، فلاتصدوهم بالأحاديث عن رسول الله (ﷺ)، فتشغلوهم، جودوا القرآن، وأقلوا الرواية عن النبي (ﷺ)“. [تذکرۃ الحفاظ:]

(ترجمہ: تم ایک ایسے شہر جا رہے ہو جس میں اس کے باشندوں کی قرآن کی تلاوت اس طرح گونجتی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گونج پیدا ہوتی ہے، لہٰذا تم رسول اکرم (ﷺ) کی احادیث بیان کر کر کے ان لوگوں کو قرآن کے ساتھ ان کے اشتغال سے نہ روک دینا، قرآن کی تعلیم خوب اچھی طرح دینا، اور رسول اللہ (ﷺ) کی حدیثیں کم بیان کرنا)۔

بالکل واضح ہے کہ حضرت عمر حضرت کعب بن قرظہ اور ان کے ساتھیوں کو یہ نصیحت فرما رہے تھے کہ اہل عراق قرآن مجید سے بہت اشتغال رکھتے ہیں، وہاں جا کر تم حدیثیں اس کثرت سے نہ سنانے لگنا کہ لوگ قرآن مجید سے اشتغال کو چھوڑ دیں، یعنی حضرت عمر اتنی زیادہ حدیثیں نقل کرنے سے منع فرما رہے تھے کہ ان کی کثرت کی وجہ سے قرآن مجید سے اشتغال کا وہ ماحول ختم ہو جائے جو وہاں پایا جاتا تھا۔

لیکن کثرتِ روایت سے منع کرنے کی حضرت عمر کی اس ہدایت کا تذکرہ شاز صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے: ”حضرت عمرؓ کے ذہن میں تاریخ اور وحی کا یہ فرق [خیال رہے کہ شاز صاحب کے نزدیک حدیث نبوی وحی نہیں ہے، بلکہ وہ صرف تاریخ ہیں، پچھلی قسط میں ہم ان کے اس نظریہ پر کلام کر چکے ہیں] اتنا واضح تھا کہ آپ نے قرظہ بن کعب کو عراق بھیجتے ہوئے صریح الفاظ میں یہ تاکید کی کہ وہاں لوگوں کو حدیثوں میں پھنسا کر قرآن سے نہ روکنا“ [ادراک: ۲۰۲/۱]۔ کہاں حضرت عمر کی ہدایت کہ روایتیں کم بیان کرنا اور کہاں شاز صاحب کی یہ تعبیر کہ: حدیثوں میں پھنسا کر قرآن سے نہ روکنا؟ بس اسی طرح کے تصرفات سے شاز صاحب نے حضرت عمر کی جانب اس غلط نظریہ کو منسوب کرنا چاہا ہے۔

حضرت عمرؓ کا روایت حدیث کے سلسلہ میں اصل موقف کیا تھا؟ اس کو صحیح بخاریؒ میں درج ہوئی اس روایت سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعری حضرت عمرؓ کے گھر گئے، اور داخل ہونے کی اجازت تین مرتبہ چاہی، اجازت نہ ملی تو وہ واپس ہونے لگے، حضرت عمرؓ نے ان کو روک کر پوچھا کہ تم واپس کیوں ہو گئے؟ انہوں نے کہا میں نے تین مرتبہ اجازت چاہی، لیکن نہیں ملی، تو میں واپس ہو گیا، اس لیے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا تھا: جب تم میں سے کوئی مرتبہ اجازت چاہے اور نہ ملے تو واپس ہو جائے، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر کہا کہ تمہیں اس بات پر کوئی گواہ لانا ہوگا کہ رسول اللہ (ﷺ) نے یہ بات فرمائی تھی، اس کے بعد حضرت ابوسعید خدری نے جا کر حضرت عمر سے کہا کہ ہاں یہ بات رسول اللہ (ﷺ) نے فرمائی تھی [صحیح بخاری: کتاب الاستیذان، باب التسلیم والاستیذان]۔ یہ روایت صاف طور پر بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث کے خلاف ہرگز نہیں تھے، بس اس سلسلہ میں احتیاط کے قائل وداعی تھے، انہیں حضرت ابوموسیٰ کے بیان پر حیرت ہوئی تو انہوں نے ان سے کسی اور صحابی سے تصدیق کرانے کو کہا، یہ صرف روایت حدیث کی بابت ایک احتیاطی رجحان تھا، روایت حدیث سے روکنے اور منع کرنے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس موقعہ پر ایک یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی بابت جن روایتوں کی غلط تشریح کر کے ان حضرات کو اپنا ہم رائے بتانے کی کوشش شاز صاحب اور ان کے پیش رووں نے کی ہے وہ تمام روایات کسی قابل اعتماد سند سے ہم تک نہیں پہنچی ہیں، یعنی اول تو ان روایتوں سے وہ ثابت نہیں ہوتا جو شاز صاحب ثابت کرنا چاہتے ہیں اور پھر یہ روایتیں سندی اعتبار سے ایسی نہیں ہیں کہ ان سے کچھ ثابت کیا جا سکے، جب کہ صحیح سند کے ساتھ مروی بے شمار روایتوں سے ان حضرات کا حدیثیں نقل کرنا اور انہیں ماخذ دین سمجھنا ثابت ہے۔ (...........جاری)☆☆☆

نقد و نظر

راشد شاز اور مسجد اقصیٰ

قبلہ اولیٰ کے تعلق سے راشد شاز کے افکار کا تنقیدی جائزہ

محمد غزالی ندوی

تمام محدثین، مفسرین اور مؤرخین اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ ہجرت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک مسلمان مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے، پھر قبلہ تبدیل ہو گیا اور مسلمان کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔ تفسیر، حدیث اور تاریخ کی شاید ہی کوئی کتاب اس واقعہ کے تذکرہ سے خالی ہو، لیکن شاز صاحب کا ماننا ہے کہ مسجد اقصیٰ کی طرف مسلمانوں نے رخ کر کے کبھی نماز نہیں پڑھی اور تحویل قبلہ کا واقعہ سرے سے غلط ہے، شاز صاحب کے اس موقف کا محاکمہ اس لیے بہت ضروری ہے کہ مسجد اقصیٰ کا قبلہ اولیٰ ہونا صرف ایک تاریخی حقیقت ہی نہیں ہے بلکہ قضیۂ فلسطین سے مسلمانوں کے جذباتی لگاؤ کی بہت بڑی وجہ بھی ہے، اور اس سلسلہ میں ادنیٰ سی غلط فہمی مسجد اقصیٰ اور فلسطین کی آزادی میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔

تحویل قبلہ کے تعلق سے شاز صاحب کی تحریر کئی مغالطوں پر مشتمل ہے، پہلا مغالطہ انہوں نے یہ دیا ہے کہ جن آیات سے تحویل قبلہ پر استدلال کیا جاتا ہے وہ تحویل قبلہ پر دلالت نہیں کرتیں، ان کی عبارت ملاحظہ کیجئے:

''اہل یہود کے مذہبی اور تہذیبی جاہ و حشمت کا تصور ہمارے مفسرین کے دل و دماغ پر کچھ اس طرح حاوی رہا کہ ہم نے منہدم شدہ ہیکل سلیمانی کو عارضی قبلہ کی حیثیت سے قبول کرنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کیا اور اس خیال کی تصدیق کے لیے سورۂ بقرہ کی آیت ﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ﴾ کے ارد گرد روایات و قصص کی دیوار کھڑی کر دی''۔ (راشد شاز، ادراک زوال امت، نئی دہلی ۲۰۰۵ ج ۲، ص/۱۵۲)

اس عبارت میں جہاں شاز صاحب نے تحویل قبلہ کا انکار کیا ہے وہیں مسجد اقصیٰ کو مفروضہ ہیکل سلیمانی کی جگہ پر قائم بتایا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ عرض ہے کہ یہ یہودیوں کا تصور اور موقف ہے کہ منہدم شدہ ہیکل سلیمانی کی جگہ پر مسجد اقصیٰ قائم ہے، اس طرح کی بے بنیاد باتوں سے درحقیقت یہودی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان جس کو مسجد اقصیٰ اور قبلۂ اولیٰ مانتے ہیں وہ درحقیقت یہودیوں کا مقدس ہیکل سلیمانی ہے اس لیے اس پر یہودیوں کا حق ہونا چاہیے۔ لیکن مسلمان تو نہ کسی ہیکل سلیمانی کے قائل ہیں اور نہ ہی مفروضہ ہیکل سلیمانی کو اپنا قبلہ اولیٰ سمجھتے ہیں۔ ہیکل سلیمانی کی حقیقت مسلمانوں کے نزدیک ایک تاریخی مفروضہ Historical fiction سے زیادہ نہیں ہے، مسلمان مسجد اقصیٰ کو اپنا قبلہ اولیٰ مانتے ہیں جو تب سے قائم ہے جب داؤد وسلیمان علیہما السلام اس دنیا میں تشریف بھی نہیں لائے تھے۔ اور جب یہودیوں کا اس دنیا میں وجود بھی نہ تھا، اس بحث میں خواہ مخواہ ہیکل سلیمانی کا تذکرہ کرنا یہودیوں کے موقف کو تقویت پہنچانے کا باعث ہے، بالفاظ دیگر یہودیوں کے موقف کو ایک الگ فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کی ناکام و نامراد کوشش ہے۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: قلت يا رسول الله ﷺ! أي مسجد وضع في الأرض اول؟ قال: المسجد الحرام، قال: قلت: ثم أيّ؟ قال: المسجد الأقصىٰ، قلت: كم كان بينهما؟ قال: أربعون سنة اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دنیا میں سب سے پہلے مسجد حرام اور دوسرے نمبر پر مسجد اقصیٰ بنی ہے،، اور دونوں کے درمیان صرف چالیس سال کا فاصلہ رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مسجد حرام کب بنی ہے؟ تو کوئی بھی عقل رکھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ آدم علیہ السلام کے زمانہ میں بنی ہوگی اس لئے کہ حضرت آدمؑ نبی تھے اور ان کے

زمانہ میں سب اہل ایمان تھے تو وہ سب بغیر مسجد کے کیوں کر رہ سکتے ہیں۔ قرآن میں بھی ہے کہ سب سے پہلی مسجد "مسجد حرام" ہے ﴿ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ﴾ اور مسجد حرام پہلی مسجد تبھی ہو سکتی ہے جب وہ حضرت آدمؑ کے زمانہ میں بنی ہو ورنہ یہ ماننا لازم آئے گا کہ حضرت آدمؑ سے لے حضرت ابراہیمؑ تک ہزاروں انبیاء بغیر مسجد کے رہے، ان سب کی دینی زندگی کا کوئی مرکز نہیں رہا اور یہ بات کسی طرح قرین قیاس نہیں۔ احادیث وآثار اور تاریخ کی کتابوں سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے تعمیر ہو گئی تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ حج کرتے وقت وادي عسفان سے گذرے تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: اے ابوبکر یہ کون سی وادی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: یہ وادئ عسفان ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہاں سے ہود اور صالح بھی سرخ اونٹنیوں پر گذرے ہیں، ان کے ازار عبائیں تھیں اور ان کی چادریں نمروں کی تھیں، وہ لبیک کہتے تھے، اور اس بیت عتیق یعنی کعبہ کا حج کرتے تھے"۔ چونکہ حضرت ہود و صالح علیہما السلام کا زمانہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہے اس لئے ثابت ہوا کہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے بھی موجود تھا۔ (مسند أحمد، الفتح الربانی حدیث ۱۰۳۲۷، ۱۰۳۳۲)، حافظ ابن کثیرؒ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے (البدایۃ والنہایۃ، المکتبۃ التوفیقیۃ، قصۃ صالح نبی ثمود علیہ السلام، ج۱، ص/۱۵۷) حافظ ابن حجرؒ نے ابن الجوزیؒ کا قول نقل کیا ہے: "ليس ابراهيم اوّل من بنى الكعبة ولا سليمان اوّل من بيت المقدس فقد روينا أن اول من بنى الكعبة آدم ثم انتشر ولده في الأرض، فجائز أن يكون بعضهم قد وضع بيت المقدس ثم بنى ابراهيم الكعبة بنص القرآن و كذا قال القرطبي انّ الحديث لا يدلّ على أنّ ابراهيم و سليمان لمّا بنيا المسجدين ابتدآ وضعهما لهما بل ذلك تجديد لما كان أسسهما غيرهما" ابن الجوزی کا یہ قول اور بعض دوسرے تائیدی اقوال نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں: "قد وجدت ما يشهد له ويؤيد قول من قال: إنّ آدم هو الذي أسس كلا من المسجدين فذكر ابن هشام في كتاب التيجان أنّ آدم لمّا بنى الكعبة أمره الله بالسير إلى بيت المقدس وأن يبنيه فبناه ونسك فيه"۔ (فتح الباري كتاب احاديث الأنبياء، باب قوله تعالىٰ ﴿واتخذ الله ابراهيم خليلا﴾ حديث ۳۳۶۶)۔

قرآن کی آیات سے بھی یہی مضمون سمجھ میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: "اور وہ وقت یاد کرو جب حضرت ابراہیمؑ و اسمعیلؑ کعبہ کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے اور وہ دعاء کر رہے تھے کہ ہمارے رب اس خدمت کو ہم سے قبول فرما، بے شک تو سمیع وعلیم ہے"۔ [البقرۃ۔۱۲۷] اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنیادیں پہلے سے موجود تھیں جن کو اٹھایا جا رہا تھا یعنی کعبہ کبھی پہلے تعمیر ہو چکا تھا جس کی بنیادیں باقی رہ گئی تھیں۔ حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کا بھی یہی خیال ہے، حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ نے ان کا قول نقل کیا ہے: عن سعيد بن جبير عن ابن عباسؓ ﴿وإذ يرفع ابراهيم القواعد من البيت﴾ قال: القواعد التي كانت قواعد البيت قبل ذلك۔ (تفسير ابن كثير ج۱، ص/۳۳۶، موسسة الريان)

دوسری آیت میں ارشاد باری ہے: ﴿ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتك المحرم﴾ ابراہیمؑ فرماتے ہیں: "اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد کو اس بنجر وادی میں تیرے باحرمت گھر کے پاس آباد کر دیا ہے" [ابراہیم ۳۷] اس آیت سے ظاہر ہوا کہ اسمعیلؑ کے آباد کرنے سے پہلے وہاں کوئی باحرمت مسجد موجود تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اب ایک اور آیت ملاحظہ فرمایئے: ﴿يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ [المائدۃ ۲۱] حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "اے قوم! اس ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ، یہ اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے"۔ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اس سرزمین کو مقدس فرمانا اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب وہ زمین پہلے سے مقدس چلی آرہی ہو، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تک وہاں کوئی بیت المقدس نہ ہو محض زمین مقدس نہیں ہو سکتی۔ پس ثابت ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے صدیوں پہلے اس سرزمین میں بیت المقدس تعمیر ہو چکا تھا (تفہیم اسلام ص ۲۶۹۔۲۷۰) رہا سلیمان علیہ السلام کا بیت المقدس کو بنانا تو یہ بنائے ثانیہ ہے نہ کہ بنائے اولین، جیسا کہ امام قرطبیؒ کی مذکورہ بالا تشریح سے واضح ہے۔

ان تمام تفصیلات سے سمجھا جا سکتا ہے کہ مسلمان جس کو قبلہ اولیٰ

سمجھتے ہیں وہ حضرت سلیمان کا بنایا ہوا مفروضہ ہیکل سلیمانی نہیں بلکہ مسجد اقصیٰ ہے جو حضرت سلیمان سے صدیوں پہلے سے قائم ہے اس لیے نہ اسے ہیکل سلیمانی کہنا درست ہے نہ ہی اسے یہودیوں کے تشخص کی علامت قرار دینا جائز ہے کہ اس کو قبلہ اولیٰ ماننے پر یہودیت سے مرعوبیت کی پھبتی کسی جائے، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اس کے لیے ہیکل سلیمانی کا لفظ استعمال کرنا یہودی مفروضات پر ایمان لانے کی علامت ہے۔

تحویل قبلہ کی احادیث پر شاز صاحب کا طنز: شاز صاحب نے لکھا ہے کہ مسجد اقصیٰ کو (جس کے لیے انہوں نے ہیکل سلیمانی کا لفظ استعمال کیا ہے) عارضی قبلہ کی حیثیت سے قبول کرنے کے لیے مسلمانوں نے ﴿سَیَقُولُ السُّفَھَاءُ...﴾ کے اردگرد روایات وقصص کی دیوار کھڑی کردی"

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان روایات سے صرف نظر بھی کرلیا جائے جو ﴿سَیَقُولُ السُّفَھَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاھُمْ عَن قِبْلَتِھِمُ الَّتِیْ کَانُوا عَلَیْھَا﴾ کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں اور خالصتاً عربی زبان کے نقطۂ نظر سے ﴿سَیَقُولُ السُّفَھَاءُ﴾ اور مابعد کی آیات پڑھی جائیں تب بھی ایک خالی الذہن قاری کو یہی سمجھ میں آئے گا کہ ان آیات میں ایک قبلہ سے دوسرے قبلہ کی تحویل کی بات کہی جارہی ہے۔ ثانیاً ان روایات کو ماننے سے کیوں انکار کردیا جائے؟ اس کی کوئی وجہ شاز صاحب نے نہیں لکھی ہے حالانکہ یہ بات علمی منہج کے خلاف ہے۔ یہ درحقیقت مستشرقین کا انداز ہے وہ بھی ہوا میں تیر چلاتے ہیں اور اسلامی حقائق میں سے کسی چیز کو جب اپنی تشکیک کی زد میں لانا چاہتے ہیں تو کسی دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، مثلاً مستشرق جوزیف ہورفٹز نے یہ دعوی کیا ہے کہ قرآن نے بہت سے قصے اور احکام تورات سے اخذ کیے ہیں اور ان کو بغیر تورات کا حوالہ دیے نقل کیا ہے وفی القرآن الی جانب مثل هذه الاشارات البينة الى التورة قصص واحكام استقاها منها ورددها فی مواضع كثيرة دون أن يذكر المصدر الذی نقل عنه (دائرۃ المعارف الاسلامیہ جلد۶ صفحہ ۱-۲) اتنی بڑی بات مستشرق صاحب کہہ کر چلے گئے لیکن کوئی معقول دلیل پیش نہیں کی، یہی طریقہ شاز صاحب نے اپنایا ہے۔ تحویل قبلہ کی روایات میں اگر کسی قسم کا سقم ہے تو ایک ایک روایت کے سقم کو واضح کرنے کی ضرورت تھی، اسی طرح اگر واقعتاً مسلمانوں نے ہیکل سلیمانی کو ہی قبلہ اولیٰ اور مسجد اقصی تسلیم کر لیا تھا تو اس کے اس قدر دلائل دینے کی ضرورت تھی کہ یہ مسئلہ بالکل بے غبار ہو جاتا، یہاں تو شاز صاحب نے ایک بھی دلیل نہیں دی، صرف یہودیوں کی بے بنیاد باتوں کو دہرا دیا۔ کیا علم وتحقیق اسی کا نام ہے؟

تحویل قبلہ کے سلسلہ میں دوسرا مغالطہ: شاز صاحب لکھتے ہیں: "گوکہ تاریخی اعتبار سے یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ ہجرت کے بعد کوئی سال ڈیڑھ سال کے عرصے تک مسلمان حرم کعبہ کے بجائے ہیکل سلیمانی یا بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہے، کعبہ سے بیت المقدس اور بیت المقدس سے دوبارہ کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی کے سلسلہ میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان میں تاریخی اعتبار سے بھی تناقض موجود ہے"۔ (راشد شاز، ادراک زوال امت نئی دہلی ۲۰۰۵ ج ۱/ص ۱۵۲)

ازالہ: جہاں تک اس بات کے تاریخی ثبوتوں کا تعلق ہے کہ مسلمان ہجرت کے بعد ڈیڑھ سال بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہے تو گوکہ ہم انہیں ابھی پیش کریں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تحویل قبلہ کے ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ تو قرآن سے بھی ثابت ہے، احادیث وآثار سے بھی اور تاریخ سے بھی، اور مسلمانوں کی ہر نسل نے دوسری نسل کو یہ بات اس طرح منتقل کی ہے کہ یہ چیز مسلمانوں کے لیے ایسی بدیہی اور قطعی ہوچکی ہے کہ اب اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں ثبوت اس کو پیش کرنے کی ضرورت ہے جو اس کا انکار کرے اس لئے کہ وہ ایک تاریخی حقیقت کا انکار کررہا ہے، اور کوئی منکر ان شاءاللہ اس سلسلہ میں ایک بھی ثبوت پیش نہیں کرسکے گا۔

تحویل قبلہ کے تاریخی ثبوت:

صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب توجه االقبلة حيث كان میں ہے: عن البراء قال كان رسول اللهﷺ صلى نحو بيت المقدس ستة عشر شهرا أو سبعة عشر شهرا وكان رسول اللهﷺ يحب أن يوجه الى الكعبة فأنزل الله عز وجل ﴿قد نرى تقلب وجهك في السماء﴾

فتوجه نحو الكعبة۔ **کتب حدیث سے ایک مثال کے بعد اب کتب سیرت وتاریخ سے بھی ایک شاہد دیکھ لیا جائے:**

السيرةالنبويه لابن هشام **میں ہے:** قال ابن اسحاق ولما صرفت القبلة عن الشام الى الكعبة وصرفت في رجب على رأس سبعة عشر شهرا من مقدم رسول اللهﷺالمدينة أتى رسول اللهﷺ رفاعة بن قيسؓ وقردم بن عمرو و كعب بن اشرف ورافع بن ابى رافع والحجاج بن عمرو حليف كعب بن الاشرف والربيع بن الربيع بن ابى الحقيق فقالوا: يا محمدﷺ! ما ولّاك عن قبلتك التي كنت عليها۔(السيرة النبوية لابن هشام، باب ما قالته اليهود عند صرف القبلة الى الكعبة)۔ **اسی طرح حافظ ابن کثیر نے** البداية والنهاية **میں، طبری نے تاریخ طبری میں، ابن الاثیر الجزری نے** الكامل فى التاريخ **میں، ابن العماد الحنبلی نے** شذرات الذهب **میں بلکہ تقریباً تمام ہی مؤرخین نے اپنی تواریخ میں تحویل قبلہ کا ذکر کیا ہے۔ کیا ان ثبوتوں کے بعد بھی یہ کہنا کہ تحویل قبلہ کا واقعہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا، تاریخ، علم اور تحقیق کے ساتھ ظلم نہیں ہے؟ یقیناً اسے علم وتحقیق کے ساتھ ظلم ہی قرار دیا جائے گا کیونکہ اس کی بنیاد ایک دیدہ ودانستہ اور سوچی سمجھی فاش غلطی پر رکھی گئی ہے۔**

تحویل قبلہ کے سلسلہ میں تیسرا مغالطہ:

شاز صاحب لکھتے ہیں: ''کعبہ سے بیت المقدس اور بیت المقدس سے دوبارہ کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی کے سلسلہ میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان میں تاریخی اعتبار سے بھی تناقض موجود ہے''۔

ازالہ: پتہ نہیں شاز صاحب کس تناقض کے بارے میں بات کر رہے ہیں، جتنی روایات بھی اس سلسلہ میں ہیں ان میں اس اعتبار سے تو کوئی تناقض نہیں ہے کہ تحویل قبلہ کا واقعہ ہوا تھا اور مسلمان ایک عرصہ تک مسجد اقصیٰ کی طرف نماز پڑھ رہے تھے۔ جو کچھ معمولی سا تناقض پایا جاتا ہے وہ مدت کی تعیین اور اضافی معلومات کے سلسلہ میں ہے، جیسے کہ کتنے دن تک بیت المقدس قبلہ رہا سولہ مہینے، سترہ مہینے یا اٹھارہ مہینے؟ جب دوبارہ کعبہ کو قبلہ بنایا گیا تو وہ رجب کا مہینہ تھا یا شعبان کا؟ تاریخ طبری میں ہے: ہجرت کے دوسرے سال ماہ شعبان میں اللہ عزوجل نے مسلمانوں کے قبلہ کو شام کی سمت سے کعبہ کی طرف بدل دیا، تبدیلی کے وقت میں علمائے سلف کا اختلاف ہے مگر جمہور کا خیال یہ ہے کہ ہجرت کے اٹھارہویں ماہ نصف شعبان میں یہ تبدیلی عمل میں آئی'' ۔تاریخ طبری حصہ اول، ص/ ۱۵۷، ۱۵۸ مترجم سید محمد ابراہیم ایم۔ اے۔ ندوی، حافظی بک ڈپو دیوبند۔ ہر عقل مند انسان سوچ سکتا ہے کہ اس طرح کی تفصیلات میں اختلاف کی بناء پر فی نفسہ تحویل قبلہ کا ثبوت متأثر نہیں ہوسکتا ہے، اس کی واضح مثال ہم اس طرح دیتے ہیں کہ شاز صاحب بہار کے ہیں، وہاں عام طور پر دیہاتوں میں بچہ کی تاریخ پیدائش کو تحریری طور پر محفوظ رکھنے کا معمول نہیں ہے، لوگ عام طور پر کسی کی شادی، کسی کی موت یا اور کسی اہم واقعہ سے مربوط کر کے بچوں کی پیدائش کا تذکرہ کرتے ہیں، اس میں بسا اوقات گھر کی عورتوں میں اختلاف بھی ہوجاتا ہے لیکن وہ اختلاف اضافی تفصیلات میں ہوتا ہے نہ کہ فی نفسہ پیدائش میں، اب اگر شاز صاحب کے گاؤں کی دو عورتوں میں شاز صاحب کی پیدائش کے تعلق سے اختلاف ہوجائے کہ سنہ پیدائش ۶۵ ہے یا ۶۶ یا ۶۷ تو اس سے کیا آپ فی نفسہ ان کی پیدائش کا انکار کر سکتے ہیں؟ بالکل یہی معاملہ یہاں تحویل قبلہ کے تعلق سے ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر تاریخ میں اختلاف کی بنیاد پر چیزوں کو غلط ثابت کیا جائے تو خود حضرت محمدﷺ کی تشریف آوری پر شک کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی ولادت کی تاریخ میں بھی اختلاف ہے اور جنگ بدر کے وقوع میں بھی شک پیدا کیا جا سکتا ہے کہ بعض مؤرخین کے نزدیک وہ ۱۷ رمضان کو ہوئی اور بعض کے نزدیک ۱۹ کو، لیکن کوئی عقل مند انسان ان جزئی اختلافات کی بنیاد پر کسی واقعہ کے وقوع میں شک نہیں کرتا، اسی طرح تحویل قبلہ کے وقوع میں بھی اس طرح کے اختلافات کی بناء پر شک نہیں کیا جا سکتا۔

تحویل قبلہ کے سلسلہ میں شاز صاحب کا چوتھا مغالطہ:

شاز صاحب لکھتے ہیں: ''پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ مدینہ پہنچ کر آپ نے مکہ کے بجائے بیت المقدس کا انتخاب کیوں کیا کہ اس سلسلہ میں کوئی ہدایت قرآن مجید میں نہیں ملتی اور اگر یہ مان لیا جائے کہ ایسا کرنے کا حکم آپ کو بذریعہ وحی خفی ہوا تھا تو پھر یہ بات رسول کی شان عبودیت سے میل نہیں کھاتی کہ وہ اس

منشائے الٰہی کو اپنی خواہشات وسفارشات سے تبدیل کرانے پر مصر ہو'۔(راشد شاز، ادراک زوال امت، نئی دہلی، ج ۱، ص ۵۲)۱

ازالہ : شاز صاحب نے اس عبارت میں تحویل قبلہ پر دو اعتراض کیے ہیں:

۱) بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم قرآن میں کہیں نہیں ہے اس لیے آپ ﷺ نے کس بنیاد پر بجائے کعبہ کے بیت المقدس کی طرف رخ کیا؟

۲) یہ بات رسول کی شان عبودیت سے میل نہیں کھاتی کہ وہ اس منشائے الٰہی کو اپنی خواہشات وسفارشات سے تبدیل کرانے پر مصر ہو'۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جس طرح بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کے لیے کوئی حکم قرآن میں نہیں آیا اسی طرح کعبہ کی طرف رخ کرنے کا کوئی حکم بھی قرآن میں ان آیات سے قبل نازل نہیں ہوا تو شاز صاحب کے بقول اگر مسلمان کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے تو کس آیت قرآنی کی بناء پر؟ اگر قرآن ہی سے ہر چیز کو ثابت کرنا ضروری ہے تو بتایا جائے کہ کس آیت کی بناء پر مسلمان پہلے مکہ یا مدینہ میں کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھ رہے تھے؟ صحیح بات یہ ہے کہ مسلمان مکہ میں کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور اس کا حکم بھی قرآن کے بجائے وحیِ خفی کے ذریعہ ملا تھا اور مدینہ پہنچنے کے بعد سترہ اٹھارہ مہینے وہ خدا کے حکم سے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے اور یہ حکم بھی قرآن کے بجائے وحیِ خفی کے ذریعہ ملا تھا۔

شاز صاحب کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اول تو نبی نے تحویل قبلہ کے سلسلہ میں خدا سے اصرار نہیں کیا تھا، صرف ایک دلی خواہش تھی جس کے ساتھ آپ کی نگاہیں بعض اوقات آسمان کی طرف اٹھ جاتی تھیں اس کے لیے ''خواہشات وسفارشات سے تبدیل کرانے پر مصر ہونا'' کی تعبیر استعمال کرنا شاز صاحب کی خانہ زاد تفسیر ہے، ثانیاً اس طرح کی خواہش یا درخواست ودعا کے تعلق سے یہ کہنا کہ ''یہ بات رسول کی شان عبودیت سے میل نہیں کھاتی کہ وہ اس منشائے الٰہی کو اپنی خواہشات وسفارشات سے تبدیل کرانے پر مصر ہو'' یہ جملہ نہایت خطرناک ہے اور دخل در معقولات سے تعلق رکھتا ہے، کیا چیز رسول کی شان عبودیت سے میل کھاتی ہے اور کیا چیز میل نہیں کھاتی، کون سی چیز رسول کے لیے مناسب ہے اور کون سی چیز نہیں، اس کا معیار ہم اور آپ طے کرنے والے کون ہیں؟ یہ ساری چیزیں بھی قرآن طے کرے گا نہ کہ کسی کے خودساختہ افکار، قرآن میں اس سے بھی آگے کی چیزیں رسولوں کے تعلق سے مذکور ہیں اور انہیں قرآن نے رسول کی شان عبودیت کے خلاف نہیں مانا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ پڑھیے، قرآن کہتا ہے: ﴿فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَى يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ﴾[هود: ۷۴ تا ۷۶] یہ آیات بتاتی ہیں کہ اللہ نے قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لیے فرشتوں کو بھیجا تو جیسے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ بات پتہ چلی تو وہ خدا کے سامنے عذاب کو رکوانے کے لیے اصرار کرنے لگے، یہ اصرار الحاح وزاری کے انداز کا تھا، قرآن نے اس کو ﴿يُجَادِلُنَا﴾ سے تعبیر کیا ہے لیکن قرآن نے اس کو شان نبوت کے منافی نہیں قرار دیا بلکہ دیکھئے خدا نے اس اصرار پر کتنا پیار بھرا جملہ ارشاد فرمایا ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ﴾ پھر یہ بھی نہیں کہا کہ اپنے منصب کا خیال کیجئے بلکہ محبت سے بھرپور انداز میں یوں فرمایا: ﴿يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خدا کے ساتھ مذکورہ بالا مکالمہ اگر ذہن میں رکھا جائے تو شاز صاحب کی مذکورہ بالا دلیل بالکل بے وزن ہو جاتی ہے۔

تحویل قبلہ کے سلسلہ میں پانچواں مغالطہ : شاز صاحب لکھتے ہیں: ''جو شخص بھی ان مفروضہ آیات قبلہ کا اضافی معلومات سے الگ ہو کر مطالعہ کرے گا اس پر یہ بات واضح ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ ان آیات میں دراصل اہل یہود سے الگ ایک علیحدہ امت اور ایک الگ قبلہ کی بات کہی جارہی ہے ﴿وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ﴾(البقرة/۱۴۵) صاف بتایا جارہا ہے کہ آپ کی تمام دلیلیں اہل کتاب کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتیں کہ وہ آپ کا

قبلہ قبول کر لیں اور نہ ہی آپ ان کے قبلہ کو قبول کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ وہ خود آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کو قبول نہیں کرتے''۔(راشد شاز.................ص۱۵۲)

ازالہ: شاز صاحب نے جو آیت پیش کی ہے وہ اس وقت کی ہے جب کہ مسلمانوں کو دوبارہ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے دیا گیا تھا چنانچہ شاز صاحب کی پیش کردہ آیت سے سابقہ آیت میں ﴿فول وجهك شطر المسجد الحرام﴾ مذکور ہے، ظاہری بات ہے کہ مسجد حرام کی طرف رُخ کرنے کا حکم ملنے کے بعد نبی بیت المقدس کی طرف رُخ کیوں کر سکتے تھے، نہ ہی یہودیوں کے نسلی تعصب کی بناء پر ان سے اس بات کی توقع تھی کہ وہ مسلمان ہو کر خدا کے حکم کے مطابق کعبہ کی طرف رُخ کریں گے، یہ ہے وہ حقیقت جس کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے جو شاز صاحب نے پیش کی ہے، اس آیت سے یہ مفہوم اخذ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ بیت المقدس کی طرف نماز میں رُخ کرنے کا حکم کبھی تھا ہی نہیں، اس لیے کہ سابقہ آیات بہت وضاحت سے اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم بعد میں ملا ہے پہلے مسلمان کسی اور طرف نماز میں رُخ کر رہے تھے۔گذشتہ آیات میں ﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا﴾ ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ﴾ ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾ کے الفاظ واضح طور پر دلالت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو کسی طرف سے رُخ تبدیل کر کے کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

تحویل قبلہ کے سلسلہ میں چھٹا مغالطہ: شاز صاحب نے تحویل قبلہ پر دلالت کرنے والی آیات میں معنوی تحریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اضافی معلومات اور یہودی پس منظر کے زیر اثر ہم جس آیت کو تحویل قبلہ کی آیت قرار دیئے بیٹھے ہیں اگر صرف قرآنی پس منظر میں ان آیات کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں ہجرت کے بعد پیدا ہونے والے ذہنی اور نفسیاتی بحران کا بیان ملتا ہے اور بس، مکہ اپنی مرکزیت یعنی شہر بیت الحرام کے سبب حق و باطل کا پیمانہ رہا ہے، اہل عرب جانتے تھے کہ محمدؐ اگر واقعی سچے نبی ہیں تو عنقریب حرم کعبہ پر انہیں غلبہ حاصل ہو جائے گا البتہ واقعۂ ہجرت نے دشمنوں کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ اس نبی برحق کو آخر کیوں اس قبلہ اور علامت نصرت سے محروم کر دیا گیا، ان آیات میں رسول کو دراصل اطمینان قلب دلایا گیا ہے کہ ہم اس بات سے واقف ہیں کہ مسجد حرام سے دوری آپ پر کتنی شاق گذر رہی ہے، جلد ہی ہم آپ کو آپ کا قبلہ واپس دلائیں گے، دنیا جانتی ہے کہ اللہ کا یہ وعدہ برحق پورا ہو کر رہا''۔راشد شاز، ادراک زوال امت، نئی دہلی، ج۲، ص۱۵۳

شاز صاحب نے اس عبارت میں یہ بتانا چاہا ہے کہ جن آیات سے تحویل قبلہ پر استدلال کیا جاتا ہے وہ دراصل مسلمانوں کی مکہ سے دوری پر دلالت کرتی ہیں یعنی ﴿مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا﴾ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہودیوں نے اعتراض کیا تھا کہ کس چیز نے مسلمانوں کا رخ بیت المقدس سے پھیر دیا بلکہ اس میں لوگوں کا یہ اعتراض ذکر کیا گیا ہے کہ اگر مسلمان برحق تھے تو پھر کس چیز نے ان کو مکہ اور کعبہ سے دور کر دیا اسی طرح ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾ سے یہ نہیں بتایا جا رہا ہے کہ ہم آپ کا رُخ پھر سے بیت المقدس سے کعبہ کی طرف کر دیں گے بلکہ یہ کہا جا رہا ہے کہ جلد ہی ہم آپ کو مکہ پر غلبہ عطا کر کے آپ کا قبلہ واپس دلائیں گے۔یہ ہے وہ مفہوم جو شاز صاحب تحویل قبلہ کی آیات کا بیان کرتے ہیں لیکن اس میں جس جسارت کے ساتھ قرآن میں معنوی تحریف کی کوشش کی گئی ہے اس کی مثال دور دور تک ملنا مشکل ہے۔آیئے متعلقہ آیات پر غور کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان آیات کا اصل مفہوم کیا ہے۔

اللہ پاک فرماتے ہیں: ﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُل لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾۔تمام مسلمانوں کے نزدیک اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی کے بعد اللہ پاک نے ارشاد فرمایا کہ عنقریب لوگ کہیں گے کہ کس چیز نے ان کو ان کے قبلہ (بیت المقدس) سے پھیر دیا، آپ کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب سب خدا کا ہے وہ جب چاہے بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دے اور جب چاہے کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دے، کسی کو اس میں کچھ بولنے کا کیا اختیار ہے؟ یہ ہے اس آیت کا صحیح مفہوم جس کو تمام

مسلمانوں نے از اول تا آخر مراد لیا ہے اور جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قبلہ پہلے بیت المقدس تھا پھر بعد میں کعبہ کو قبلہ بنایا گیا۔اس کے برخلاف شاز صاحب اس آیت سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اللہ پاک مکہ سے مدینہ مسلمانوں کے ہجرت کرنے کے بعد اس آیت میں یہ فرما رہے ہیں کہ عنقریب بے وقوف لوگ کہیں گے کہ کس چیز نے ان کو ان کے قبلہ یعنی کعبہ سے دور کر دیا۔

لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا ﴿مَا وَلّٰهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُواْ عَلَيْهَا﴾ میں وہ مفہوم لینے کی گنجائش ہے جو شاز صاحب لے رہے ہیں، اگر آپ ﴿قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُواْ عَلَيْهَا﴾ کے الفاظ پر غور کریں اور آپ کے پاس عربیت کا سلیم ذوق بھی ہو اور آپ الفاظ کے استعمال سے بھی واقف ہوں تو آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ کعبہ سے دوری کو ﴿قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُواْ عَلَيْهَا﴾ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، ﴿الَّتِیْ كَانُواْ عَلَيْهَا﴾ کا استعمال صاف طور پر بتا رہا ہے کہ ایسے قبلہ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جس پر پہلے مسلمان قائم تھے، اور اب خدائی حکم کی وجہ سے انہوں نے ادھر سے رخ پھیر کر کسی اور طرف کر لیا تھا جس پر بے وقوفوں کی زبانیں چلنے لگی تھیں۔اگر ایسا ہی تھا کہ پہلے بھی مسلمان کعبہ ہی کی طرف رخ کر رہے تھے اور صرف کعبہ سے ان کے دور ہونے پر لوگوں نے ﴿مَا وَلّٰهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُواْ عَلَيْهَا﴾ کی پھبتی کسی تھی تو اس میں ﴿كَانُواْ﴾ کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا، تب تو یوں کہنا چاہیے تھا مَا وَلّٰهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ هُمْ عَلَيْهَا، کہ کس چیز نے ان کو اس قبلہ سے دور کر دیا جس پر قائم ہیں، اگر کوئی یہ کہے کہ ﴿كَانُواْ عَلَيْهَا﴾ سے درحقیقت اعتراض کرنے والوں نے یہ بتانا چاہا تھا کہ مکہ میں جس قبلہ کے پاس مسلمان تھے اس سے کس چیز نے ان کو دور کر کے مدینہ پہنچا دیا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس عربیت کی رو سے ﴿كَانُواْ عَلَيْهَا﴾ سے خانہ کعبہ کے پاس ہونا مراد لیا جاسکتا ہے؟ عربی زبان کسی کی خانہ ساز زبان تو ہے نہیں کہ کوئی جس طرح چاہے اس کو موڑ دے، کیا قرآن سے کوئی مفہوم اخذ کرتے وقت زبان کے قواعد کی رعایت چنداں ضروری نہیں؟ بتایا جائے کہ اگر کوئی کسی سے یہ کہنا چاہے کہ میں نے وہ یونیورسٹی دیکھی ہے جس کے پاس تم رہتے تھے، تو کیا وہ زرت الجامعة التي كنت عليها کہہ سکتا ہے؟ اسی لیے امام ابن تیمیہؒ نے شریعت کی صحیح سمجھ کے لیے عربی زبان سے واقفیت کو لازم قرار دیا تھا، لیکن شاز صاحب نے قدماء کی تمام چیزوں کی تنقید کے شوق میں اس فکر کو بھی تختۂ مشق بنایا حالانکہ اس کمی نے خود شاز صاحب سے کتنی غلطیاں کرائی ہیں اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو عربیت میں مہارت کے ساتھ ان کی کتاب کا مطالعہ کرے، عام قاری تو صرف ان کے الفاظ کے پیچ وخم میں ہی رہ جاتا ہے۔

تحویل قبلہ کے دلائل

پہلی دلیل: ﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُواْ عَلَيْهَا قُل لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِیْ مَن يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ اس کی تشریح اوپر گذر چکی ہے۔

تحویل قبلہ کی دوسری دلیل:

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ﴾ اس آیت میں اللہ پاک فرما رہے ہیں کہ ہم نے اس قبلہ کو جس پر آپ تھے صرف یہ جاننے کے لیے بنایا تھا کہ الخ، اس میں بھی ﴿الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنتَ عَلَيْهَا﴾ ”جس پر آپ تھے“ کا لفظ صریح طور پر اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ کوئی قبلہ تبدیل کیا گیا ہے، اگر فرض کر لیجئے کہ تحویل قبلہ نہیں ہوا، پہلے بھی کعبہ ہی قبلہ تھا اور آیت کے نزول کے وقت بھی وہی قبلہ تھا تو پھر ﴿الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنتَ عَلَيْهَا﴾ کس بات کو بتا رہا ہے؟ ﴿كُنتَ﴾ سے کیا مراد ہے؟ ﴿الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنتَ عَلَيْهَا﴾ کے بجائے القبلة التي أنت عليها کیوں نہیں کہا؟

تحویل قبلہ کی تیسری اور سب سے بڑی دلیل:

آیات قبلہ ہی میں ایک ٹکڑا یہ بھی ہے ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ اللہ کے رسول ﷺ کی خواہش تھی کہ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف قبلہ تبدیل کر دیا جائے، آپ ﷺ اس خواہش میں بار بار آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے تھے تو اللہ نے ارشاد فرمایا: ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ کہ ہم آپ کا رخ ضرور اس قبلہ کی طرف کر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں تو اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف کر لیجئے۔

یہ آیت واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قبلہ پہلے کچھ اور تھا بعد میں کعبہ کو قبلہ بنایا گیا، لیکن شاز صاحب اس کا مفہوم یہ

بتاتے ہیں کہ چونکہ نبی کریم ﷺ پر مکہ سے دوری بہت شاق گزر رہی تھی اس لیے اس آیت میں نبی ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ ہم آپ کو آپ کا قبلہ واپس دلائیں گے۔لیکن شاز صاحب نے اس آیت میں دو باتوں پر غور نہیں کیا جن میں سے ہر ایک ان کے بیان کردہ مفہوم کو لینے سے مانع ہے، پہلی بات یہ ہے کہ ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾ میں ﴿قِبْلَةً﴾ کو نکرہ استعمال کیا گیا ہے، اور عربی کا قاعدہ ہے کہ جب کسی چیز کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہو تو دوبارہ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کو نکرہ استعمال نہیں کرتے بلکہ معرفہ استعمال کرتے ہیں۔عربی قواعد کی مستند اور مشہور زمانہ کتاب قطر الندیٰ کے مصنف نے اس قاعدہ کو بڑی وضاحت سے مثال دے کر سمجھایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ کہیں 'اشتریت فرساً ثم بعت الفرس' میں نے ایک گھوڑا خریدا پھر میں نے گھوڑا بیچ دیا، تو اس بعت الفرس میں الفرس معرفہ استعمال کیا گیا ہے اس لیے اس سے مراد وہی گھوڑا ہوگا جس کا تذکرہ اشتریت فرساً میں کیا گیا ہے، اس کے برخلاف اگر کوئی کہے اشتریت فرساً ثم بعت فرساً میں نے ایک گھوڑا خریدا پھر میں نے ایک گھوڑا بیچا تو چونکہ "بعت فرساً" میں 'فرساً نکرہ استعمال کیا گیا ہے اس لیے بعت فرساً سے مراد کوئی اور گھوڑا ہوگا اور اشتریت فرساً سے مراد کوئی اور دوسرا گھوڑا۔

ابن ہشام انصاری نے اس قاعدہ کی مثال میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش کی ہے: ﴿اَللّٰهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ﴾[النور: ۳۵] اس آیت میں پہلی مرتبہ ﴿مِصْبَاحٌ﴾ نکرہ استعمال ہوا ہے پھر دوبارہ چونکہ اسی مِصْبَاحٌ کا تذکرہ مقصود تھا تو اسے معرفہ استعمال کرتے ہوئے ﴿الْمِصْبَاحُ﴾ کہا گیا ہے، اسی طرح آیت میں دو مرتبہ زُجَاجَة کا لفظ استعمال ہوا ہے چونکہ دونوں مرتبہ ایک ہی طرح کے زُجَاجَة مراد ہیں اس لیے دوسری مرتبہ اسے معرفہ استعمال کیا گیا ہے۔(**قطر الندیٰ، باب:" الخامس من المعارف"**)

شاز صاحب کے مطابق پہلی دو آیتوں میں کعبہ سے دوری کا تذکرہ کیا گیا ہے اور تیسری آیت میں نبی کو اطمینان و تسلی دلاتے ہوئے کعبہ کو واپس دلانے کی بات کہی گئی ہے، لیکن مذکورہ بالا عربی قاعدہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾ پر غور کیجئے، اس آیت سے پہلے دو آیتوں میں 'قبلة کا لفظ استعمال ہوا ہے، سورۃ بقرۃ آیت نمبر/۱۴۲ میں قبلة کا لفظ استعمال ہوا ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ﴾ پھر اس سے اگلی آیت میں کہا گیا ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾ اب اگر شاز صاحب کے مطابق یکے بعد دیگرے آنے والی تینوں آیتوں میں مذکور لفظ قبلہ سے کعبہ مراد ہے تو تیسری آیت میں ﴿قِبْلَةً﴾ کو نکرہ کیوں لائے؟ معمولی سی عربی جاننے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾ میں ﴿قِبْلَةً﴾ کو نکرہ لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہاں ایسے دو قبلوں کی بات چل رہی ہے جن سے مسلمانوں کا مذہبی تعلق رہا ہے، ایک وہ جس سے تحویل کا تذکرہ ﴿مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا﴾ اور ﴿وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا﴾ میں کیا جا رہا ہے اور دوسرا قبلہ وہ ہے جس کی طرف تحویل کا تذکرہ ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾ میں کیا جا رہا ہے۔

ہم شاز صاحب سے اس قاعدہ کے تعلق سے اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں:

فان کنت لا تدری فتلک مصیبة

وان کنت تدری فالمصیبة أعظم

قِبْلَة کو نکرہ لا کر ساتھ میں ترضها کا لفظ لانا بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ دو قبلوں میں سے نبی کے لیے وہ قبلہ منتخب کیا جا رہا ہے جس کی طرف اس کا طبعي میلان ہے، ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ﴾ کا ترجمہ خواہ آپ رُخ پھیرنا کریں یا قبلہ واپس دلانا بہر حال یہ سوال ہے کہ تَرْضَاهَا کا لفظ ساتھ میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کی وجہ جاننا ضروری ہے، مسلمانوں کی تشریح کے مطابق محمد ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے لیکن آپ ﷺ کی طبعی خواہش یہ تھی کہ کعبہ کو قبلہ بنا دیا جائے، آپ کی اسی طبعی تمنا کی طرف ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾ میں لفظ ﴿تَرْضَاهَا﴾ سے اشارہ کیا گیا ہے، اس تشریح میں ﴿تَرْضَاهَا﴾ کی معنویت واضح ہے۔اس کے برخلاف راشد شاز صاحب کی تشریح یہ ہے کہ قبلہ تو ہمیشہ سے کعبہ تھا البتہ چونکہ اس سے دوری مسلمانوں پر شاق گزر

رہی تھی اس لیے نبی کو اطمینان دلایا گیا ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾ شاز صاحب کی تشریح کے مطابق اس آیت کا ترجمہ یوں ہوگا ’’تو ہم آپ کو ایک ایسا قبلہ واپس دلائیں گے جو آپ کو پسند ہے‘‘ اب آپ خود سوچیے کہ جب قبلہ ہمیشہ سے کعبہ ہی تھا اور اسی کو واپس دلانے کی بات کہی جا رہی ہے تو پھر ’’ایک ایسا قبلہ‘‘ کیوں کہا گیا اور مزید ’’جو آپ کو پسند ہے‘‘ کی قید کیوں لگائی گئی، ذرا بتایئے کسی آدمی کے پاس اگر ایک ہی بیٹا ہو اور وہ اغوا ہو جائے تو کیا آپ اس سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم تمہیں ایک ایسا بیٹا واپس دلائیں گے جو تم کو پسند ہے جب اس بے چارے کے پاس ایک ہی بیٹا ہے تو ’’ایک ایسا بیٹا‘‘ کے کیا معنیٰ ؟ اور جب وہ ایک ہی ہے تو پسند اور ناپسند کے کیا معنیٰ ؟

تحویل قبلہ کی چوتھی عظیم الشان

دلیـــــــل: تحویل قبلہ کی ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے لے کر آج تک تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ ﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ﴾ اور مابعد کی آیات میں تحویل قبلہ کا ذکر ہے، پوری اسلامی تاریخ میں تمام مسلمان اس بات پر متفق رہے ہیں کہ مسجد اقصیٰ قبلہ تھی پھر کعبہ کو قبلہ بنایا گیا، اس موجودہ صدی سے پہلے چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں دو چار نام بھی ایسے نہیں لیے جا سکتے ہیں جنہوں نے تحویل قبلہ کو نہ مانا ہو۔ ہاں جب سے اسرائیل اور مسلمانوں کی کش مکش شروع ہوئی ہے تب سے ضرور ایسا ہوا ہے کہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت کو مشکوک بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، جو لوگ ہماری اس بات پر چیں بہ جبیں ہوں وہ بتائیں کہ ارض مقدس کے حصول کے لیے مسلمانوں اور یہودیوں کی موجودہ کش مکش سے پہلے کیا وہ پوری اسلامی تاریخ میں ایک بھی نام ایسا دکھا سکتے ہیں جس نے تحویل قبلہ کا اگر انکار نہیں تو کم از کم اس میں شک کا اظہار ہی کیا ہو، اگر آج کچھ لوگ اس طرح کی چیزیں کرتے ہیں تو اس بات میں کیا شک ہے کہ وہ ان لوگوں کا راگ الاپ رہے ہیں جو مسجد اقصیٰ پر مسلمانوں کے استحقاق کو ختم کرنے کے لیے نہ صرف عسکری، سیاسی اور سفارتی داؤ پیچ اپنا رہے ہیں بلکہ تاریخی بنیادوں کو بھی ختم کرنا چاہتے ہیں۔

بہر حال تحویل قبلہ پر مسلمانوں کا اتفاق اور اجماع اس بات کی آخری دلیل ہے کہ پہلے مسلمانوں کا قبلہ مسجد اقصیٰ تھا پھر کعبہ بنایا گیا، اگر شاز صاحب یہ کہیں کہ ہم اجماع کو نہیں مانتے تو ہم ان سے عرض کرنا چاہیں گے کہ بارہا آپ نے اپنی تحریروں میں اجماع سے استدلال کیا ہے، پھر یہ کون سی بات ہے کہ جہاں چاہیں آپ اجماع کو دلیل بنائیں اور جہاں بات دل لگتی نہ ہو، وہاں اجماع کو دلیل ماننے سے انکار کر دیں۔

اب لگے ہاتھوں شاز صاحب کی ایک عبارت پر نظر ڈال لیجیے جس میں انہوں نے اجماع سے استدلال کیا ہے، یہ تحریر اس وقت کی ہے جب وہ اسلامی انقلاب، خلافت کے احیاء اور دارالاسلام کے قیام کی بلند و بالا باتیں کیا کرتے تھے، پھر یہ ہوا کہ دارالاسلام کی اصطلاح سے بھی انہیں چڑ ہوگئی ، یہ سب کچھ کیسے ہوا اس کے اسباب نامعلوم ہیں۔ بہر حال مختلف ممالک میں کیا اسلامی ایجنڈا ہونا چاہیے اس کو بیان کرتے ہوئے سابق دارالاسلام کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: ’’مدینے کی چھوٹی سی اسلامی ریاست جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں قائم ہوئی تھی اور جس کا سیاسی شیرازہ ان دنوں منتشر ہے اسے دوبارہ قائم کرنا اور اس کی فکری اور جغرافیائی سرحدوں کو مسلسل وسعت دیتے رہنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے ۔رہے وہ ممالک جو کبھی خلافت کا حصہ رہ چکے ہوں <u>تو اس بارے میں فقہاء کا اجماع ہے</u> کہ کسی سابق دارالاسلام میں مسلمانوں کے لیے صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ اسے دوبارہ دارالاسلام بنانے کی جدوجہد کریں‘‘ (راشد شاز، ہندوستانی مسلمان ایام گم گشتہ کے پچاس برس، نئی دہلی ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۸۔۱۴۹)

خلاصہ یہ کہ تحویل قبلہ کی پوری بحث میں شاز صاحب نے جا بجا جس ’’یہودی اثر‘‘ کے قبول کرنے کا الزام محدثین ومفسرین ومؤرخین اسلام پر عائد کیا ہے، منصفانہ اور ناقدانہ نظر رکھنے والا صاف دیکھ سکتا ہے کہ خود ان کی یہ پوری بحث یہودی تحریکات سے آخری درجہ کی مرعوبیت کا نتیجہ ہے، جو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ واقعی کیا انہوں نے یہ تحقیقات مرعوبیت کے سبب فرمائی ہیں یا پھر بات کچھ اور ہے......؟؟

☆☆☆

چند فارغین برج کورس کے تاثرات

نوٹ: قارئین کو یاد ہوگا کہ راقم نے برج کورس کے متعلق ایک اداریہ میں اپنے تأثرات کا اظہار کیا تھا اور ملت اسلامیہ کو اس جانب توجہ دلائی تھی کہ برج کورس فی نفسہ ایک اچھی کوشش ہے لیکن اس کی کمان جن ہاتھوں میں ہے وہ ہاتھ کبھی تعمیر ملت کا کام انجام نہیں دے سکتے، اس لیے کہ انہیں تخریب کاری کا ہنر سکھایا گیا ہے اسی کی بدولت وہ ہائی پروفائی بن سکے ہیں، چنانچہ علی گڑھ کے نئے ''مصلح العلماء'' نے برج کورس کی کمان سنبھالتے ہی وہاں آنے والے نو فارغ طلبہ میں تشکیکی مزاج کی تشکیل شروع کر دی، طلبہ کو مختلف کورسیز کا اہل (Eligble) بنانے کے بجائے انہیں Interfaith & Intrafaith کی کج بحثی میں الجھا دیا، راقم نے جب مدارس کے نو فارغین کو اس قدر متاثر ہوتے دیکھا کہ وہ سوشل میڈیا پر تمام علماء و محدثین واسلاف کی بخیہ دری کرنے لگے تو اپنا مذہبی فریضہ سمجھا کہ جو بن پڑے کیا جائے، لیکن ''مجدد تلبیس'' یا ''تلبیسات کے بازی گر'' نے ہماری ہر تحریر کا رخ اس طرف موڑ دیا کہ اہل مدارس برج کورس کی مخالفت کر رہے ہیں، حیرت تو تب دوبالا ہوئی کہ ان کی اس تحریک میں بے چارے حضرت غطریف بھی پیش پیش نظر آئے، خدا سے دعا ہے کہ وہ انہیں معاشی آسودگی سے ہمکنار کر دے تا کہ وہ باطل کی چاکری سے باز آجائیں، خدا گواہ کہ غطریف صاحب جس سطح کے عالم ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ شاذ صاحب کی تلبیسات کیا کیا ہیں اور کہاں کہاں ہیں مگر افسوس۔۔۔۔

تلبیسات کا ایک مظہر ''المدرسہ'' میگزین اور ''دستک'' نامی تعارفی کتابچہ تھا، ان دونوں میں طلبہ و طالبات کے تاثرات درج کئے گئے تھے، آخر الذکر کے ایڈیٹر و مرتب غطریف شہباز صاحب ہی تھے، جب یہ تاثرات پڑھے تو سمجھ میں نہ آسکا کہ آخر ان طلبہ و طالبات کو ایک سال میں ہی کیا گھول کر پلا دیا گیا، ہر تاثراتی بیان میں مدرسہ کی برائی کا عنصر، گزشتہ زندگی کے ضیاع کا احساس، برج کورس کی افادیت اور حضرت ''مصلح العلماء'' کی مدح سرائی بلکہ ان کی جادوئی شخصیت کی سحر انگیز اثر افرینی کا بیان تھا، برج کورس میں ڈائریکٹر صاحب کی بیگم کا کوئی دخل نہیں مگر تحریک تلبیس میں بیگم شاذ ''مولاتنا'' کوثر صاحبہ شوہر نامدار کی معاونت نہیں بلکہ قیادت کرتی ہیں، ان تاثرات کی ترتیب میں خوب خوب دجل و تلبیس سے کام لیا گیا، ایڈیٹنگ کی مہارت کا پورا زور صرف کیا گیا، جو طلبہ کسی طرح دام فریب میں نہ آئے اور مطلب کی بات لکھنے سے انکار کیا، ان کے تاثرات شائع نہیں کیے گئے، متعدد طلبہ سے گفتگو کی تو وہ شکوہ کرنے لگے کہ ہم نے تو شاذ صاحب سے بھی احتجاج کیا کہ آپ نے ہمارے تاثرات کو اس طرح کیوں پیش کیا کہ اب ہم شرمسار ہو رہے ہیں، یہاں کے ایک لوکل طالب علم کے تاثرات انتہائی خطرناک، گمراہ کن اور رکیک تھے، اس سے ملاقات کی تو وہ احساس ندامت سے گڑا جا رہا تھا، اس نے کہا کہ ہم نے سخت احتجاج کیا کہ آپ کی اس خیانت کے باعث اب ہم اپنے گھر والوں کو کیا منہ دکھائیں مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

جن لوگوں کے پاس وہ تاثرات ہیں، انہیں سامنے رکھیں اور اب برج کورس کے فارغین کے ان تاثرات کا ان سے موازنہ کریں، معیار و اسلوب کے سبب ''تلبیسی کارنامہ'' واضح ہو جائے گا، شاذ صاحب برج کورس میں کیا کرتے ہیں، اس کا صحیح اندازہ ان تاثرات سے ہوگا، تاثرات کی اشاعت کا یہ سلسلہ مدارس کے ان طلبہ کے لیے ہے جو برج کورس کو للچائی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اسے اپنی مجبوری سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں، یہ انشاء اللہ سلسلہ جاری رہے گا، آپ برج کورس میں آتے ہیں تو ضرور آئیں لیکن اپنا ماضی ساتھ لے کر آئیں، فکری پختگی اور ذہنی تیاری کے ساتھ آئیں ورنہ شاذ صاحب آپ کو اپنی ''انجمن علماء اسلام'' کا رکن بنانے میں کامیاب ہو گئے تو پھر آپ طوطے کی طرح تحقیق کے نام پر ان کی زبان بولیں گے اور اس طرح وہ دین اسلام کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے مگر امت مرحوم میں ایک انتشار پیدا کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے، سنا ہے آج کل ''معلم العلماء'' اسی ''انجمن علماء اسلام'' کی تربیت و فروغ میں سرگرداں ہیں، دیکھیے اس سے کب فتوی صادر کراتے ہیں عورت کی امامت کے جواز کا، جانے کیوں ان کے اندر عورت کی امامت میں نماز پڑھنے کا شوق انگڑائی لے رہا ہے، ان تاثرات کو پڑھیے، ہوش کے ناخن لیجئے اور باطل کا علاج کیجئے، اگر بات فروعی و نظریاتی اختلاف کی ہوتی تو ہم اسے کبھی تعاقب کے لائق نہیں سمجھتے، لیکن یہاں ایک ''نئے اسلام'' کو وجود بخشنے کی تحریک جاری ہے، تلبیس کی مجلس آراستہ ہے، اس کی سرکوبی وقت و ملت و مذہب کا تقاضہ ہے، اللہ تعالیٰ دیکھیے کس کس کو اس کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ (ادارہ)

برج کورس کے بارے اگر یہ کہا یا لکھا جائے تو یہ بے جا نہیں ہوگا کہ یہ کورس بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سر سید احمد خان کے خوابوں کی ایک تعبیر ہے جسے انہوں نے اس طور پر دیکھا تھا کہ مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں قرآن پاک تو دوسرے میں سائنسی علوم بلفظ دیگر عصری وجدید علوم بھی ہوتا کہ دنیا میں امن وآشتی کے کام کو بآسانی فروغ دیا جا سکے اور مسلمان خود بھی اپنی قوت پرواز بلند کرسکیں اور شاید اسی خواب کی ایک کڑی کی حیثیت سے پورا کرنے کے لئے موجودہ وائس چانسلر آف اے۔ایم۔یو کے دور میں اس کورس کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ کورس ایک ایسے شخص کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جس کا ذوق طلبائے مدارس اسلامیہ میں عصری علوم سے آگاہی اور اس کے تقاضے کو پورا کرنے میں کم اور مدارس وعلماء اور دیگر دینی مسائل میں خامیاں تلاش کرنے میں زیادہ ہے۔

جناب راشد شاز صاحب جو اس وقت اس کورس کے ڈائریکٹر ہیں۔ اگر ان کے کارنامے پر تفصیلی تفتگو کی جائے تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آسکتی ہے اور یہاں ایک مختصر تأثر پیش کرنا مقصود ہے جس میں زیادہ وضاحت کی قطعا گنجائش نہیں۔ اس کورس کے نصاب کو دیکھا جائے تو یقیناً بہترین نصاب تعلیم معلوم ہوگا۔ لیکن مشکل اس طور پر محسوس ہوگا کہ یہ نصاب تعلیم فقط ہاتھی کے دانت کی حیثیت رکھتا ہے جو کھانے کا کچھ دکھانے کا کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کورس میں انگریزی تعلیم کے کلاسیز تو دن بھر میں کم وبیش چھ ہوتے ہیں لیکن حاصل ایک کا بھی نہیں نکلتا، اور اس میں کامیابی کا سہرا لینے کے لئے تو پوچھئے مت، جناب شاز صاحب چند طالب علموں کو جو پہلے ہی سے انگریزی بولنے پر قدرت رکھتے تھے انہیں کچھ تقریریں رٹا کر مہمانوں کے سامنے اپنی کامیابی کا سہرا باندھ لیتے ہیں اور اسی کے ذریعہ مدارس کی خامیاں نکالنے میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں۔

اسی طرح دیگر علوم وفنون جس کی حالت تو یہ ہے کہ وہ تمام سبجیکٹ امتحان سے چندروز قبل ہی بطور تیاری کے دوڑا دیے جاتے ہیں۔ اگر زیادہ محنت کی جاتی ہے تو وہ ہے انٹرفیتھ Interfaith اور انٹرافیتھ Intrafaith جس میں جناب شاز صاحب اپنی فکر کے ذریعے طلبائے مدارس کی ذہن سازی کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ انٹرفیتھ اور انٹرافیتھ کے کلاسوں میں بنیادی سبق یہی ہوتا ہے کہ بریلوی، دیوبندی اور شیعہ سنی ک اتحاد ممکن ہے کہ نہیں ساتھ ہی ساتھ برج کورس کے فائدے اور تمام طالب علموں کا ٹرننگ پوائنٹ کیا ہے، انہی سب پر جناب شاز صاحب کا لیکچر ختم ہوتا ہے، جس کے لئے وہ سب سے زیادہ ٹائم لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ یقیناً ان میں چند سبق تو بہت اچھا ہے لیکن پریشانی اس بات پر ہے کہ جناب کا سارا ماحصل یہی ہوتا ہے کہ مدرسے میں کچھ نہیں سکھایا گیا بلکہ ساری کامیابی تو برج کورس میں آنے کے بعد ملی اس سے پہلے تو سب اندھیرے میں تھے۔ جس کو "المدرسہ میگزین" میں بھی محسوس کیا سکتا ہے جس میں شاز صاحب نے خود سے لڑکوں کے مضامین طے کئے ہیں اور طلباء کی تحریر کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔

آخر میں یہی کہوں گا کہ برج کورس فی نفسہ بہت اچھے عزائم پر قائم کیا گیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے شاز صاحب کے شاطرانہ اور مستشرقانہ طرز عمل نے بالکل ایک طرح سے ہائی جیک کرلیا ہے جس کی اصلاح اس وقت بے حد ضروری ہے۔ اور اس کے لئے میں اے۔ایم۔یو۔ انظامیہ سے مؤدبانہ درخواست کروں گا کہ وہ اس کورس کے نظم ونسق پر نظر ثانی کریں تا کہ بہت ساری خامیاں جو اس وقت ہیں، اسے دور کیا جا سکے اور طلبائے مدارس کے لئے مزید بہتر نظام تعلیم تیار کیا جا سکے جو وقت کا اہم تقاضا ہے۔

اور مزید یہ بھی کہوں گا کہ برج کورس کرنے کے بعد طلباء جس جس شعبہ میں داخلے کے لائق ہوتے ہیں، وہ بغیر برج کورس کئے بھی ہوسکتے ہیں بس اس کے لئے ضروری ہے یونیورسٹی انتظامیہ انہیں موقع دیں تا کہ مدارس کے طلبہ کے لئے مزید راہیں ہموار ہوسکے۔

محمد عقیل اختر سعیدی

سابق طالبعلم برج کورس اے۔ایم۔یو۔علی گڑھ۔

☆☆☆

میں اے ایم یو میں B.A Political Science کا طالب علم ہوں۔ میں نے ۲۰۱۴ء میں ایشیاء کی عظیم درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے عالمیت کا کورس مکمل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم

یونیورسٹی میں شعبہ برج کورس میں داخلہ کے لئے Form Apply کیا نتیجۃ میرا ایڈمیشن بھی ہوگیا میں نے اس کورس میں اس امید کے ساتھ ایڈمیشن لیا تھا کہ شاید اسے کرنے کے بعد Social Science کے کسی اچھے Subject سے گریجویشن کرنے کے قابل ہوجاؤں گا م جیسے اس کورس کا بنیادی مقصد ہے اور آپ حضرات Social Media اور اخبارات میں خوب پڑھتے ہوں گے اور یہ بھی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پچھلے دو تین سال سے ایسے Modern علماء کی جماعت تیار کر رہی ہے جو انگریزی زبان پہ قدرت کے ساتھ ساتھ دیگر انفارمیشن اور ٹکنالوجی میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور اسی طریقے سے کہ برج کورس میں مسلم مسائل پر گفتگو کی جاتی ہے اور ٹوپی حجاب کے نیچے دبی عقل کھولنے کا کام کیا جاتا ہے، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوتا بلکہ کچھ لوگوں نے اس کورس کو اغوا کر رکھا ہے اور محترم وائس چانسلر کے آنکھوں میں دھول ڈال کر اپنی ڈکٹیٹر شب قائم کر رکھی ہے جس کا وہ طلبہ کے سامنے ذکر بھی کرتے ہیں، کہ وائس چانسلر نے مجھے اختیار کل دے رکھا ہے لہذا کسی بھی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کی جائے گی۔

میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں یہاں کے طلبہ انگریزی زبان میں مہارت تو دور ٹھیک سے اپنا مافی الضمیر بھی ادا کر نہیں کر پاتے ہیں صرف انہی طلبہ کو جو پہلے سے انگریزی لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں شاز صاحب اپنی جانب سے دو تین صفحہ کی تقریریں رٹوا کر جس میں مدرسہ، علماء، ائمہ وغیرہ کی برائیاں اور برج کورس کی آڑ میں اپنی بے جا تعریف باہر سے آنے والے مہمانوں کے سامنے کروا کر خوب داد و تحسین حاصل کرتے رہتے ہیں، ان طلبہ کی ساری کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھتے رہتے ہیں، اسی طریقے سے برج کورس میں مسلم مسائل پر گفتگو نہیں کی جاتی ہے بلکہ اس آڑ میں فتنہ سازی کو فروغ دینے اور اس کے لئے حربہ اپنانے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے اور اسی طریقے سے ٹوپی اور حجاب کے نیچے دبی عقل کھولنے کا کام نہیں بلکہ دل و دماغ کو خیانت کا مرکز بنانے کام کیا جاتا ہے۔

خیر میں آپ کو برج کورس کا ایک سابق طالب علم ہونے کے ناطے بتادوں کہ برج کورس فی نفسہ ایک اچھا کورس ہے جو طلبہ مدارس کے لئے کافی سودمند ثابت ہوگا اگر اس کے بنیادی مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے آگے بڑھایا جائے، جیسا کہ میں نے خود Political Science کے لئے برج کورس کی بدولت ہی Eligeble ہوا ہوں۔ لیکن یہاں تو جناب شاز صاحب اپنی فکر کو تھوپنے اور سوچ کو طلبہ میں پیدا کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتے رہتے ہیں اور Interfaith & Intrafaith کے نام پر دیگر مذاہب کو پڑھانے کے بجائے جو ہمارا اسلامی سرمایہ ہے اسی کو غلط ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں جس کے لئے وہ روزانہ لیکچر دیتے رہتے ہیں۔

لہذا میں آپ سے کہنا چاہوں گا کہ اگر آپ یونیورسٹی آنا ہی چاہتے ہیں اور Arts اور Social Science کے کسی اچھے Subject میں ایڈمیشن چاہتے ہیں تو ایک سال برباد نہ کرکے آپ B.A. Direct میں عربی اردو سے ایڈمیشن لیجئے اور Subsidary میں اپنی پسند کے مطابق Subject لیجئے اور B.A.1 کے سالانہ امتحان میں Subsidary Subject میں 60% نمبر لاکر B.A.2 میں پسند کے مطابق Main Subject کروا لیجئے یا برج کورس کرنا ہی ہے تو میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد چلے جایئے جو اے ایم یو کے برج کورس سے اچھا ہے، جس کو کرنے کے بعد آپ کے Option اور بڑھ جائیں گے باقی فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

عرش عالم

سابق طالب علم برج کورس اے۔ایم۔یو۔

☆☆☆

میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شروع ہونے والے برج کورس میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد جب میں روزانہ کلاس میں شرکت کرنے لگا تو اُسی ہفتہ بروز سنیچر ایک مناظرہ منعقد ہوا۔ جس میں سارے طلبہ و طالبات نے شرکت کی لیکن گفتگو کچھ ہی لوگوں نے کی۔ خیر یہ تو ابھی پہلا مناظرہ تھا لیکن جب میں اپنے روم پر گیا تو پھر سوچا کہ برج کورس میں انٹرفیتھ اور انٹرا فیتھ کی کیا ضرورت

جو مسائل اور مضمون ہم لوگ تقریبا آٹھ سال تک پڑھتے رہے ہیں۔اس کو یہاں پڑھانے کی کیا ضرورت کبھی رفع دین اور غیر رفع دین پر کبھی اسلامی اور غیر اسلامی لباس پر۔اسی طریقے کے بہت سارے مضمون تھے جس پر مناظرہ ہوتا تھا، لیکن ابتداء میں اس وقت میں راشد شاز کے خیالات کو نہیں جانتا تھا کہ یہ اس طریقے کے خیالات رکھتے ہیں جو جمہور علماء سے ہٹ کر ہیں۔ مناظرہ کے بعد ہفتہ میں دو دن انٹرفیتھ اور انٹرافیتھ کی کلاس ہونے لگی جس میں تقریبا دو گھنٹہ کے قریب حضرت اپنے اُن خیالات پر تقریر کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے حضرت مولانا سید سلمان حسینی ندوی دامت برکاتہم العالیہ صاحب کی وہ کتاب ہاتھ لگی جس میں انہوں نے راشد شاز کی کتاب متحدہ اسلام پر تبصرہ کیا ہے، میں نے ان کی کتاب پڑھی تب جا کر مجھ لگا کہ یہ تو گمراہ آدمی ہے۔حدیثوں کا سرے سے انکار کر رہا ہے اس کے بعد میں خصوصی طور سے اس کے ہر لیکچر میں شامل رہا ہوں۔خیر یہ تو حضرت علماء کرام کی رہنمائی کرتے ہیں جب کہ ان کی اہلیہ کوثر فاطمہ برج کورس کی عالمات کی رہنمائی میں اہم رول ادا کرتی ہیں، وہ لڑکیوں کے پاس مستقل آتی جاتی رہتی ہیں جب کہ ان کا برج کورس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اور وہ طالبات جو مکمل طور پر پردہ کرتی ہیں ان کو شروع ہی میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ چہرہ وغیرہ پردہ میں شامل نہیں ہے۔لہذا تم لوگ چہرہ وغیرہ کو کھول کر رکھا کرو، ایک مرتبہ کی بات ہے کہ میں نے کوثر کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ تم لوگ بالکل آزاد رہا کرو، اور اپنے حق کو جانو، مزید انہوں نے یہ بھی کہا کہ کیا تم لڑکیاں اس دنیا میں کھانا پکانے، اپنے شوہر وغیرہ کا کپڑا دھونے کے لئے آئی ہو، جس طرح مرد اپنے حقوق میں آزاد ہیں اسی طرح تم لوگ بھی آزاد ہو، شاز صاحب اپنے ہر پروگرام میں یہی بات کہتے ہیں کہ یہ علماء کا وفد جو یہاں تعلیم حاصل کر رہا ہے یہ نہ شیعہ ہیں اور نہ ہی سنی ہیں اسی طرح وہ اپنے باطل خیالات کو فروغ دیتے ہیں۔

First High Profile Conference میں علماء وغیرہ کی توہین کی گئی اور بعض مقالہ نگار نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ آج امت مسلمہ میں اختلاف کی سب سے بڑی جڑ یہ علماء کرام اور مدارس اسلامیہ ہیں، بعض مہمانوں نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ یہ چندہ خور ہیں، گویا کہ ان کی جتنی بھی کانفرنسیں ہوئی ہیں اس میں علماء کرام اور مدارس اسلامیہ کو نشانہ بنایا گیا ہے حد تو یہ ہے کہ ایک مقالہ نگار نے اپنے مقالہ میں مولوی ہٹاؤ اور قوم بچاؤ کا نعرہ دیا۔

یہاں راشد شاز اپنی پوری ٹیم کے ساتھ الحاد کا درس دے رہے ہیں مستشرقین کے اسلام پر جو اعتراضات ہیں اسی اعتراضات کے ذریعہ علماء کرام کے ذہنوں میں دین کے سلسلے میں تشکیکی ذہن پیدا کر رہے ہیں، اور اپنے خطابات میں مستقل قادیانیوں کو دائرہ اسلام میں داخل کر رہے ہیں، ائمہ اربعہ، صاحبین، طرفین اور جمہور علماء پر طعن وتشنیع کرتے رہتے ہیں۔ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں مسلم پرسنل لا بورڈ، جمعیت علماء، جمعیت اہل حدیث، جماعت اسلامی اور خانقاہ کے سجادہ نشینوں سے عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ اس مسئلے کو ہلکے میں مت لیجئے اور راشد شاز کے باطل خیالات کے خلاف تحریکیں شروع کیجئے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی علماء جو راشد شاذ کے خیالات کے تحت برج کورس میں پڑھ رہے ہیں کل کو اسلام کے خلاف کھڑے ہو جائے اور اس کا پورا اندیشہ ہے، کیوں کہ کچھ ایسے علماء ہیں جو اس کے خیالات کو مانتے ہیں اور لوگوں کے درمیان اس کے خیالات کو لے کر کے بحث کرتے ہیں، اس لئے میں اپنے تمام فارغین مدارس سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر آپ عصر حاضر کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ برائے کرم اپنے مدرسہ کی سند کے ذریعہ جامعہ ملیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ہمدرد، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی کے عربی، اردو، فارسی میں داخلہ لے سکتے ہیں برائے کرم آپ برج کورس میں داخلہ نہ لیں اس وقت تک جب تک اس کا ڈائریکٹر راشد شاز ہے چونکہ اس کا کام ہی ہے الحاد کی دعوت دینا۔

فہیم احمد

سابق طالبعلم برج کورس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

☆☆☆

(**صفحہ نمبر ۵۰ کا بقیہ** ....) اب تمہیں خدا سے ڈرنا چاہیے کہ اس کے احکام کی تعمیل میں اگر کوتاہی تم نے کی تو تمہارے پاس کوئی ایسا عذر نہ ہوگا، جس کی بناء پر تمہارے ساتھ کچھ بھی نرمی کی جائے۔اب شریعت الٰہی کی خلاف ورزی کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ تم دوسروں کے اثر سے مجبور ہو، بلکہ اس کے صاف معنی ہوں گے کہ تم خدا کی اطاعت کرنا نہیں چاہتے‘‘

آگے مزید لکھتے ہیں:

’’دین کو مکمل کردینے سے مراد اس کو ایک مستقل نظامِ فکر وعمل اور ایک ایسا مکمل نظام تہذیب وتمدن بنا دیا ہے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت ورہنمائی حاصل کرنے کے لئے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔نعمت تمام کرنے سے مرادِ نعمتِ ہدایت کی تکمیل کردینا ہے۔اور اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول کرلینے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے میری اطاعت وبندگی اختیار کرنے کا جو اقرار کیا تھا، اس کو چونکہ تم اپنی سعی وعمل سے سچا اور مخلصانہ اقرار ثابت کرچکے ہو۔اس لئے میں نے اس کو درجۂ قبولیت عطا فرمایا ہے اور تمہیں عملاً اس حالت کو پہنچا دیا ہے کہ اب فی الواقع میرے سوا کسی کی اطاعت وبندگی کا جُوا تمہاری گردن پر باقی نہیں رہا۔اب جس طرح اعتقاد میں تم میرے مسلم ہو، اسی طرح عملی زندگی میں بھی میرے سوا کسی اور کے مسلم بن کر رہنے کے لئے کوئی مجبوری تمہیں لاحق نہیں رہی ہے۔ان احسانات کا ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے سکوت اختیار فرمایا ہے مگر اس اندازِ کلام سے خود بخود یہ بات نکل آتی ہے کہ جب یہ احسانات میں نے تم پر کئے تو ان کا تقاضہ یہ ہے کہ اب میرے قانون کی حدود پر قائم رہنے میں تمہاری طرف سے بھی کوئی کوتاہی نہ ہو۔‘‘ (تفہیم القرآ جلد اول)

(............جاری) ☆☆☆

جامعۃ البنات حیدرآباد
JAMIATUL BANATH HYDERABAD

شعبہ حفظ
عالمیت،فضیلت

لڑکیوں کا اعلیٰ ومعیاری دینی ۲۸ سالہ قدیم جامعہ

شہر کے اہم مقامات
سے بسوں کی سہولت

دینی تعلیم کے علاوہ انگریزی وکمپوٹر بھی سکھایا جاتا ہے۔ جس کے لئے خاص کمپیوٹر لیب پوری ضرورتوں سے آراستہ ہے۔
عثمانیہ یونیورسٹی (اورینٹل لینگویجس) کے ذریعہ میٹرک، انٹر، بی اے کے امتحانات بھی دلوائے جاتے ہیں۔
ایک سالہ اسلامک ڈپلومہ (کالج کی طالبات کے لئے) شعبۂ تربیت۔ دبلوم العالی فی علوم الشرعیہ۔
(فارغات دینی مدارس کے لئے ایک نادر موقع)

والدین سے گزارش ہے کہ اپنی لڑکیوں کی بہترین تعلیم وتربیت کے لئے اس جامعہ میں داخلہ دلوائیں۔

نوٹ: (۱) اضلاع کے طالبات کے لئے جامعہ میں معیاری ہاسٹل کی سہولت ہے۔ (۲) شہر میں اس جامعہ کی اور کوئی شاخ نہیں ہے۔

صاحب خیر حضرات جو جامعہ کا تعاون کرنا چاہتے ہیں
ہمارے بینک اکاونٹ نمبرس:

JAMIATUL BANATH HYDERABAD
Ac/No. 05110011021119. (Andhra Bank)
Ac/No. 19380100018623 (Bank of Baroda)

پتہ: جیون یار جنگ کالونی، روبرو مدینہ میڈیکل ہال، VIP اسکول کی گلی، سعید آباد، حیدرآباد۔
رابطہ نمبر: 7032101979,9848431304,(040)24553534
Website:www.jamiatulbanath.org